دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۶ ماہ ذی قعدہ ۱۴۳۱ھ مطابق ماہ اکتوبر ۲۰۱۰ء عدد ۴

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات ۲۴۲
اشتیاق احمد ظلی

مقالات

طبقات ابن سعد - ایک تجزیاتی مطالعہ ۲۴۵
پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی

حدیث نعمان بن بشیرؓ اور اس سے مستفاد احکام و مسائل ۲۷۰
جناب محفوظ الرحمٰن فیضی

خطابی کی "کتاب بیان اعجاز القرآن" اور پروفیسر عبدالعلیم ۲۸۵
ڈاکٹر محمد نعمان خان

عہد مغلیہ کے ایک بے نظیر خطاط خاندان کی ادبی خدمات ۲۹۴
پروفیسر نور السعید اختر

روداد دو روزہ "مصادر سیرت نبویؐ" سمینار ۳۰۰
کلیم صفات اصلاحی

اخبار علمیہ ۳۱۱
ک، ص اصلاحی

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر ۳۱۴
ت، ا، ندوی

مطبوعات جدیدہ ۳۱۷
ع۔ص

شذرات

مسئلہ، ایودھیا میں واقع ایک قطع آراضی پر ایک خوبصورت تاریخی مسجد کا تھا۔ جو سولہویں صدی کے تیسری دہے میں مغل حکمراں ظہیرالدین محمد بابر کے عہد حکومت میں تعمیر ہوئی تھی اور اسی نسبت سے بابری مسجد کے نام سے موسوم تھی۔ پانچ سو سال تک مسلمانوں نے اس میں نماز ادا کی۔ اس کی فضا نالہ نیم شبی اور دعاء سحر گاہی سے معمور و پرنور رہی۔ پھر ایک شب کچھ شرپسندوں نے کچھ مورتیاں لاکر وہاں رکھ دیں اور دعویٰ کیا گیا کہ جس جگہ مسجد کی عمارت ہے ٹھیک وہی جگہ رام للاّ کی جائے پیدائش ہے۔ یہ اس وقت ہوا جب ملک میں آزادی کا سورج طلوع ہو چکا تھا اور جمہوری حکومت قائم ہو چکی تھی۔ انصاف کا تقاضا تھا کہ غیر قانونی طور پر رکھی گئی ان مورتیوں کو وہاں سے اٹھا دیا جاتا اور مسجد مسلمانوں کو واگذار کر دی جاتی۔ جنھوں نے اس شب بھی وہاں نماز عشاء ادا کی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جو کچھ ہوا وہ اب تاریخ کا حصہ ہے۔ گذشتہ ساٹھ برسوں کے دوران یکے بعد دیگرے مسلسل ایسے فیصلے کئے جاتے رہے جو سچائی اور انصاف سے بعید تھے اور جو کسی بھی ملک و حکومت کے لیے قابل فخر نہیں ہو سکتے۔ الٰہ آباد ہائی کورٹ سے توقع تھی کہ بالآخر وہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرے گی اور دیر ہی سے سہی حق دار کو حق واپس مل جائے گا۔ یہ توقع کچھ بے جا بھی نہیں تھی۔ ایک تو اس لئے کہ عدالت عالیہ کا کام ہی مکمل اور بے آمیز انصاف فراہم کرنا اور ان لوگوں کی دادرسی کرنا ہے جن کو کسی وجہ سے نچلی عدالتوں سے انصاف نہ مل سکا ہو۔ دوسرے اس لئے بھی کہ جس معاملہ میں عدالت کو فیصلہ دینا تھا اس کا تعلق حق ملکیت سے تھا اور تاریخ، ثبوت اور دلائل واضح طور پر مسجد کے حق میں تھے۔ لیکن ساٹھ سال کے طویل انتظار کے بعد عدالت عالیہ نے جو فیصلہ دیا اس نے نہ صرف مسلمانوں کو مایوس کیا بلکہ غیر مسلم ماہرین قانون، مورخین، ماہرین آثار قدیمہ اور ذی شعور افراد کو بھی حیرت میں ڈال دیا۔ اس معنی میں اس فیصلہ نے ایک نئی تاریخ رقم کی ہے کہ اس میں مستحکم دلائل کے مقابلہ میں ایک دیومالائی شخصیت کے لئے کچھ لوگوں کی عقیدت (آستھا) کو فیصلہ کی بنیاد بنایا گیا

ہے۔عدالت عالیہ نے ایک خالص قانونی مسئلہ میں جو حق ملکیت سے متعلق تھا ہندوؤں کے ایک طبقہ کے ایک ایسے عقیدہ کے مطابق فیصلہ کیا جس کی تصدیق نہ قانون کے ذریعہ ممکن ہے اور نہ تاریخ کے ذریعہ۔فاضل ججوں نے اگر چہ اپنے الگ الگ فیصلوں میں کئی امور میں ایک دوسرے سے اختلاف بھی کیا ہے لیکن ایک معاملہ میں ان کے درمیان حیرت انگیز حد تک اتفاق و اتحاد نظر آیا۔وہ متفقہ طور پر اس نتیجہ پر پہونچے کہ جس جگہ مسجد کا مرکزی گنبد واقع تھا ٹھیک وہی جگہ رام للاّ کی جائے پیدائش ہے۔اس سے زیادہ حیرت انگیز وہ دلیل ہے جس کی بنیاد پر یہ فیصلہ دیا گیا۔یہ دلیل دراصل انہی لوگوں کی فراہم کردہ ہے جنہوں نے خالص سیاسی اغراض و مقاصد کے لئے جنم بھومی کی تحریک چلائی اور بابری مسجد کو دن کی روشنی میں مسمار کردیا۔اس کے بعد ملک کے طول و عرض میں جو کچھ ہوا وہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں ایک سیاہ باب کی حیثیت رکھتا ہے۔مسلمانوں کے سر سے ایک جوئے خون گذر گئی۔اس ہمہ گیر تباہی کے دردناک اثرات اور آثار اب تک باقی ہیں اور یہ زخم اب تک ویسے ہی ہرا ہے۔مجرموں کو اتنے سنگین جرم کی نہ کوئی سزا دی گئی اور نہ ان سے کوئی باز پرس کی گئی اور اب ان کی اس دلیل کو تسلیم کر کے نہ صرف یہ کہ قانون پر عقیدہ کی بالادستی تسلیم کر لی گئی بلکہ ایک طرح سے ان کو اس گھناؤنے جرم کے لئے سند جواز عطا کردی گئی اور انعام میں متنازع زمین کا دو تہائی حصہ بھی بخش دیا گیا۔غالباً اسی وجہ سے اس فیصلہ میں کہیں اور کسی انداز میں بھی بابری مسجد کی شہادت اور اس میں ملوث افراد کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

اس فیصلہ میں محکم تاریخی حقایق، پختہ ثبوتوں اور مضبوط دلائل کو جس طرح نظر انداز کیا گیا ہے اس کی تفصیل نہ تو یہاں ممکن ہے اور نہ شاید اس کی ضرورت ہے۔البتہ اس کے بعض پہلو ایسے ہیں جو مستقبل میں دستور کی بالادستی اور قانون کی حکمرانی کے لئے بڑے خطرہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔اگر دستوری اساسات اور قانونی دفعات کے بجائے عدالتیں معتقدات کی بنیاد پر فیصلے دینے لگیں تو اس کے نتائج اور عواقب کا اندازہ لگانے کے لئے کسی خاص ژرف نگاہی کی ضرورت نہیں ہے۔اقلیتوں سے تعلق رکھنے والی تاریخی عمارتیں، عبادت گاہیں اور دوسرے مذہبی مقامات خاص طور سے اس کی زد میں رہیں گے۔جب تک سپریم کی طرف سے اسے کالعدم نہیں

کر دیا جاتا یا اس پر روک نہیں لگا دی جاتی اس کو قانون کی حیثیت حاصل رہے گی اور عدالتیں اس نظیر کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کے لئے آزاد ہوں گی۔ چنانچہ اس فیصلہ سے اس طرح کے عناصر کو مزید ایسی مہم جوئیوں کے لئے ترغیب اور حوصلہ ملے گا اور ملک کی فرقہ وارانہ صورت حال پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوں گے۔

عدالت نے ایک سوال یہ بھی قائم کیا تھا کہ جس جگہ بابری مسجد تعمیر کی گئی کیا وہاں پہلے کوئی مندر تھا جسے ڈھا کر مسجد تعمیر کی گئی۔ اس کے لئے کوئی تاریخی ثبوت دستیاب نہیں تھا۔ اس لئے عدالت نے محکمہ آثارِ قدیمہ کو حکم دیا کہ متنازع جگہ پر کھدائی کر کے پتہ لگایا جائے کہ کیا وہاں پہلے کوئی مندر موجود تھا۔ اس وقت مرکز میں بی.جے.پی کی حکومت تھی۔ چنانچہ یہ بات چنداں باعث تعجب نہیں کہ محکمہ آثارِ قدیمہ نے زیر زمین ایک بڑے مندر کے آثار دریافت کر لئے۔ اس وقت بھی بہت سے مورخین اور ماہرین آثارِ قدیمہ نے اسے یکسر مسترد کر دیا تھا۔ اس کے برعکس ان کی رائے میں وہاں پائے جانے والے آثار دراصل کسی مسلم آبادی کا پتہ دے رہے تھے۔ یہ نقطہ نظر پوری قوت سے عدالت کے سامنے پیش بھی کر دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود عدالت نے اکثریتی رائے سے محکمہ آثارِ قدیمہ کے نقطہ نظر سے اتفاق کیا اور بغیر کسی علمی بنیاد کے مورخین اور ماہرین آثارِ قدیمہ کی رائے کو نظر انداز کر دیا۔ حالاں کہ یہ کسی طرح بھی ثابت نہیں کیا جاسکا کہ اگر وہاں کبھی کوئی مندر موجود بھی تھا تو اسے بابری مسجد کی تعمیر کے لئے مسمار کیا گیا۔ ہندوستان جیسے قدیم ملک میں مختلف عوامل کے زیر اثر آبادیاں قائم ہوتی اور اجڑتی رہی ہیں اور اجڑی ہوئی بستیوں کی جگہ نئی بستیاں آباد ہوتی رہی ہیں۔ اگر عدالتیں زیر زمین موجود آثار کی بنیاد پر فیصلے صادر کرنے لگیں گی تو بات کہاں جا کر رکے گی۔ ماضی میں جو کچھ ہو چکا اسے کوئی پسند کرے یا ناپسند نہ تو اسے بدلا جاسکتا ہے اور نہ اسے اپنی پسند کے مطابق ڈھالا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے درست کیا جاسکتا ہے۔ ان سے صرف عبرت حاصل کی جاسکتی ہے تاکہ ان غلطیوں سے بچا جاسکے جو پہلی نسلوں کی تباہی کی باعث ہوئیں۔ موجودہ سیاسی تقاضوں اور ضرورتوں کی تکمیل کے لئے ماضی کو بدلنے کی کوشش خطرات سے پر ہے اور اس سے احتراز ضروری ہے۔

مقالات

طبقات ابن سعد۔ ایک تجزیاتی مطالعہ

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی

محمد بن سعد ۱۶۸ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے، بعد میں بغداد میں سکونت اختیار کر لی، انہوں نے مدینہ منورہ، کوفہ جیسے مقامات کے سفر بھی کیے، محمد بن عمر واقدی کے شاگرد رشید اور ان کی کتابوں کے کاتب تھے، اسی لیے صاحب الواقدی اور کاتب الواقدی کی نسبت سے مشہور ہیں، ۲۰۰ھ میں انتقال ہوا اور بغداد میں باب شام کے قبرستان میں مدفون ہوئے، باسٹھ سال کی عمر پائی (۱)، ان کے بارے میں تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ تقویٰ، طہارت میں معروف تھے، ایک دن فصل سے روزہ رکھنا ان کا معمول تھا۔ (۲)

ابن سعد حدیث، فقہ، تاریخ، لغت، نحو، قرأت وغیرہ میں درک رکھتے تھے، محدثین نے بالعموم ان کو امین، عادل، ثقہ اور صادق اور ان کی علمی عظمت کو تسلیم کیا اور حدیث و سیرت کے سلسلہ میں ان کی معلومات کو خراج تحسین پیش کیا ہے، ابن ندیم نے لکھا ہے کہ:

کان ثقة مستورا عالمابأخبار الصحابة والتابعين ۔ (۳)	ثقہ تھے، اپنے آپ کو چھپاتے تھے، صحابہ اور تابعین کے حالات کے عالم تھے۔

ابن خلکان کا کہنا ہے کہ:

كان كثير العلم ، غزير الحديث والرواية كثير الكتب كتب الحديث والفقه وغيرها ۔ (۴)	ابن سعد بڑے علم والے تھے، حدیث اور روایت میں بڑا مقام تھا، حدیث اور فقہ میں ان کی بہت سی تصانیف ہیں۔

فیکلٹی دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

خطیب بغدادی لکھتے ہیں:

محمد عندنا من اهل العدالة وحديثه يدل على صدقه فانه يتحرى في كثير من رواياته۔(۵)	محمد بن سعد ہمارے (یعنی محدثین کے) نزدیک اہل عدالت میں سے ہیں، ان کی روایت کردہ حدیثیں ان کی صداقت پر دلالت کرتی ہیں کیونکہ وہ اپنی اکثر روایات میں چھان بین کرتے ہیں۔

آگے لکھتے ہیں کہ" كان من اهل العلم والفضل والفهم والعدالة "(۶) وہ علم وفضل اور فہم وعدالت کے حامل تھے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ"أحد الحفاظ الكبار الثقات المتحرين"(۷) وہ غور وفکر کرنے والے، بڑے ثقہ حفاظ حدیث میں سے ایک تھے۔

اہل علم میں طبقات ابن سعد کی مقبولیت: طبقات ابن سعد کے بارے میں بھی عام طور پر سیرت نگار اور مؤرخین نے اچھی رائے ظاہر کی ہے۔

خطیب بغدادی کا کہنا ہے کہ"صنف كتابا كبيرا في طبقات الصحابة والتابعين الى وقته فأجاد فيه وأحسن"۔

"صحابہ، تابعین اور اپنے معاصرین تک کے حالات پر ایک بہت بڑی نہایت فاضلانہ اور عمدہ کتاب لکھی ہے۔" یہی رائے ابن خلکان نے بھی ظاہر کی ہے۔(۸)

پروفیسر ہرووتس کا کہنا ہے"ابن اسحٰق کے بعد ابن سعد ہی وہ اولین مؤلف سمجھا جاتا ہے جس کی لکھی ہوئی سیرت مکمل حالت میں ہم تک پہنچی ہے اور چونکہ الواقدی کی کتاب المغازی کے سوا ہمارے پاس سیرت پر کوئی مکمل کتاب نہیں ہے، اس لیے اس کو سیرت کا مولف اول کہا جا سکتا ہے۔(۹)

ہندوستانی مصنفین میں سب سے زیادہ اہمیت علامہ شبلی نے دی ہے، اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ہمیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ صحابہ کے حالات میں متأخرین محدثین نے بہت سی کتابیں لکھیں، مثلاً الاستیعاب، الاصابہ، اسدالغابہ، لیکن

ابن سعد کی کتاب میں جو تفصیل اور جامعیت ہے ان کتابوں کو اس سے کچھ نسبت نہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ شاید متأخرین کو یہ کتاب ہاتھ نہیں آئی، یا ان کا مذاق ایسا تھا کہ اس قدر تفصیلی حالات کو وہ ضروری نہ سمجھے۔"(۱۰)

مولانا سعید احمد اکبرآبادی لکھتے ہیں کہ:

"الطبقات الکبیر جو عام طور سے طبقات ابن سعد کے نام سے مشہور ہے، صحابہ اور تابعین کے حالات پر نہایت جامع اور مستند کتاب ہے۔"(۱۱)

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ رقم طراز ہیں:

"یہ کتاب اسلام کی پہلی دو صدیوں کے مشاہیر کے حالات میں ایک بے مثال تالیف ہے اور سیرت نبوی کے قدیم اور نہایت قیمتی مصادر میں شمار ہوتی ہے۔"(۱۲)

پروفیسر نثار احمد فاروقی کا کہنا ہے کہ:

"ابن سعد کی کتاب الطبقات اتنی جامع ہوگئی ہے کہ پہلی دو صدیوں میں اصحاب رسول، تابعین اور تبع تابعین کی تمام علمی، سیاسی و دینی سرگرمیوں کے بارے میں اس سے زیادہ مستند معلومات کا کوئی دوسرا ذخیرہ نہیں ہے۔"(۱۳)

الطبقات کا ماخذ: الطبقات میں ابن سعد کی دو کتابیں شامل ہیں، ایک تو اخبار النبی اور دوسری الطبقات الکبیر۔

ابن سعد کے استاذ واقدی نے بھی طبقات لکھی تھی اور یہی کتاب ابن سعد کے لیے محرک اور رہنما بنی کہ وہ صدر اسلام کے صحابہ و تابعین اور تبع تابعین کے حالات مفصل لکھیں، چنانچہ ابن سعد نے ۱۵ جلدوں میں اس کتاب کو مرتب کیا اور بعض اہل علم کے بقول اپنے استاذ کی کتاب کے بڑے حصہ کو بھی اس میں شامل کرلیا۔(۱۴)

ابن سعد نے واقدی کی "الطبقات" کے علاوہ دیگر کتب مثلاً ازواج النبیؐ، وفات النبیؐ، اخبار مکہ، کتاب السیرۃ، طعم النبیؐ اور کتاب المغازی سے بھی پورا استفادہ کیا ہے بلکہ ان کتابوں کو طبقات میں جمع کیا ہے، ابن سعد نے بعض ابواب کا اضافہ کیا ہے جو واقدی کے یاں نہیں

ہیں، مثلاً حضورؐ کی کنیت کا بیان اور حضورؐ جن چیزوں سے استفادہ فرماتے تھے۔'' (۱۵)

جرمن مستشرق پروفیسر ہروتس کا کہنا ہے:

''الواقدی کی کتاب الطبقات کو ہم ایک طرح سے سیرت کے موضوع پر اس کی دوسری تالیفات کا تکملہ سمجھتے ہیں، ابن سعد نے اپنی کتاب کے متعلقہ ابواب میں ان کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے جن میں ازواج مطہرات کا ذکر ہے یا رسول اللہ کی وفات کا بیان ہے، ایک اور کتاب کی ایک فصل سے بھی اس نے مواد حاصل کیا ہے جس میں رسول اللہ کے مکتوبات یکجا کردیے گئے ہیں مگر اس کا تذکرہ علاحدہ تالیف کی حیثیت سے نہیں آیا۔'' (۱۶)

واقدی کی نگارشات کے علاوہ ابن سعد نے دوسرے اصحاب مغازی کی کتب سے بھی استفادہ اور اپنی سندوں سے اس میں گراں قدر اضافہ کیا ہے، مثلاً دویم بن یزید مقری کی سند سے ابن اسحٰق کی مغازی، اسمٰعیل بن ابی عبداللہ بن اویس کی سند سے موسیٰ بن عقبہ کی مغازی اور ابو معشر نجیح کی مغازی کا ماحصل اپنی کتاب میں جمع کیا ہے، اس طرح الطبقات صدر اسلام کے واقعات بالخصوص سیرت النبی اور صحابہ و تابعین کے حالات اور ان کے عہد کی علمی دینی اور فوجی سرگرمیوں کا ایک مفصل ریکارڈ بن گئی ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔

الطبقات کا منہج: ابن سعد نے الطبقات میں یہ نہج اپنایا ہے کہ وہ کسی واقعہ یا معلومات کے لیے متعدد اسانید ایک ساتھ بیان کردیتے ہیں، مگر محدثین کے طریقہ کے مطابق ان سب اسانید کے متون کو الگ الگ کے بہ جائے یکجا بیان کردیتے ہیں اور ایک مشترکہ بیان پیش کردیتے ہیں، گوکہ روایت کے الفاظ میں اختلاف ہو مگر ابن سعد ایک مجموعی روایت بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اور اسی میں سب کی جزئیات کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں، اس منہج کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ قاری متون کی تکرار سے بچ جاتا ہے اور ایک جامع اور مشترک خلاصہ اسے مل جاتا ہے مگر اس نہج کا ایک نقصان بھی ہے وہ یہ ہے کہ نہ اس میں راوی کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے اور نہ اختلاف لفظی کا پتہ چلتا ہے بلکہ بسا اوقات خلط مبحث کا گمان ہوتا ہے، مثال کے طور پر ابن سعد نے الطبقات کی دوسری جلد کے آغاز میں جو سلسلہ اسانید جمع کیا ہے اس حوالہ سے رسول اللہ ﷺ

کے غزوات کی تعداد ۲۷ اور سرایا کی تعداد ۴۷ رقم کی ہے (۱۷)، جب کہ انہوں نے خود ۲۸ غزوات اور ۵۶ سرایات کے احوال مفصل طور پر درج کیے ہیں، اس چوک کی وجہ غالباً یہ ہے کہ انہوں نے تمام روایات کو یکجا کر کے ایک روایت بنا دیا ہے اور یہ لکھ دیا ہے کہ دخل حدیث بغضهم فی بعض ۔ (۱۸)

ان میں سے بعض سندوں کی حدیثیں بعض میں شامل ہوگئی ہیں، اگر ابن سعد ان اسانید کی روایات کو الگ الگ لکھتے یا راجح روایت کو ذکر کرتے اور باقی کا حوالہ دے دیتے تو شاید اس طرح کا خلط مبحث نہ ہوتا۔

ابن سعد نے عام طور پر روایات کو جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے مگر ان پر نقد و تبصرہ، محاکمہ اور ترجیح اور اپنی رائے ظاہر کرنے سے گریز کیا ہے، البتہ جہاں ان کو ناگزیر محسوس ہوا ہے کہ روایت میں سقم ہے یا دوسری روایت زیادہ ثابت ہے تو اس کا بھی تذکرہ کیا ہے مگر ایسے مقامات کم ہیں مثلاً جنگ بدر کس دن واقع ہوئی تھی، اس سلسلہ میں انہوں نے متعدد روایات منفرداً جمع کی ہیں، عفان بن مسلم کے حوالہ سے بدری صحابی عامر بن ربیعہ کی روایت نقل کی ہے کہ جنگ بدر یوم الاثنین یعنی پیر کے روز واقع ہوئی تھی، ان دونوں روایتوں پر محاکمہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

قال محمد بن سعد وهذا أثبت أنه يوم الجمعة وحديث يوم الاثنين شاذ ۔ (۱۹)	محمد بن سعد نے کہا کہ یوم جمعہ زیادہ ثابت ہے اور پیر کی روایت شاذ ہے۔

اسی طرح ہاشم بن ابی حذیفہ ابن المغیرہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کا اسلام قدیم تھا، مکہ میں اسلام لائے اور ہجرت ثانیہ میں حبشہ ہجرت فرمائی لیکن محمد اسحٰق کا کہنا ہے کہ وہ "ہشام بن ابی حذیفہ ہیں" اور یہ ابن اسحٰق سے چوک ہوئی ہے، ہشام بن محمد السائب کلبی، محمد بن عمر واقدی اور بنی مخزوم کی روایت میں وہ ہاشم بن ابی حذیفہ ہیں۔ (۲۰)

اسی طرح عبداللہ بن سنجرہ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے اسرائیل ابن ابی معمر کے حوالہ سے بیان کیا کہ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: "کفر باللہ ادّعاء نسب لایعرف، غیر معروف انسان کے نسب کا دعویٰ کرنا اللہ کے ساتھ کفر ہے" اس پر ابن سعد نے یہ نقد کیا ہے "ولیس

ذالك عندی يثبت" (۲۱) اور یہ میرے نزدیک ثابت نہیں ہے"

بعض مقامات پر ابن سعد نے مختلف بلکہ متضاد روایات کو جمع کر دیا ہے اور ان میں ترجیح یا تطبیق دینے کی کوشش نہیں کی ہے مثلاً حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے تذکرہ میں کسی نامعلوم راوی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ مکہ میں اسلام لائے اور حبشہ ہجرت فرمائی، مگر واقدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ انہوں نے حبشہ ہجرت نہیں فرمائی، (۲۲) ان دونوں روایات میں سے کسی کو ترجیح نہیں دی ہے۔

ابن سعد نے جن لوگوں کے تذکرے اپنے طبقات میں قلم بند کیے ہیں ان میں اصحاب فقہ وحدیث کے فنی مقام ومرتبہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے، بالخصوص حدیث کے باب میں وہ ثقہ ہیں، ضعیف ہیں، منکر ہیں، متروک ہیں، وغیر ذالک، مثال کے طور پر حضرت امام ابوحنیفہ کے تذکرہ میں دونوں جگہ ان کو ضعیف فی الحدیث کہا ہے (۲۳)، نیز ان کے استاد حماد بن ابی سلیمان کو بھی ضعیف قرار دیا ہے۔ (۲۴)

محمد بن طلحہ بن مصرف الیامی کے بارے میں لکھا ہے کہ" له احاديث منكرة "ان کے پاس منکر احادیث ہیں (۲۵)، حالانکہ امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام ابن ماجہ، امام احمد اور امام دارمی نے ان سے اپنی صحاح اور سنن میں روایت قبول کی ہے، ابن سعد اصحاب الرواۃ ہیں اور اپنی معلومات اور اپنے اجتہاد کی بنا پر وہ اصحاب حدیث کا تذکرہ کرنے کے ساتھ فن حدیث میں ان کا مقام ومرتبہ واضح کرتے ہیں، یہ ضروری نہیں کہ ان کے تمام تر تبصرہ سے محدثین کو اتفاق ہو، چنانچہ یحییٰ بن سلم البکاء کو انہوں نے ثقہ (۲۶) مگر ائمۂ حدیث نے ان کو متروک قرار دیا ہے۔ (۲۷)

ابن سعد نے جن حضرات کا تذکرہ کیا ہے، ان کے مذہبی رجحانات کے بارے میں بھی جا بجا تبصرہ کیا ہے، مثلاً شبابہ بن سوار الفزاری کے بارے میں لکھا ہے کہ" كان مرجيا " وہ مرجی (۲۸)، ثور بن یزید الکلاعی قدری (۲۹)، خالد بن مخلد قطوانی" فی التشيع مفرط" غالی شیعہ تھے (۳۰)، اسی طرح بہت سے اہل علم کے مسلکی رجحان کے بارے میں خاموشی بھی اختیار کی ہے۔

طبقات کی ترتیب: ابن سعد نے طبقات کی ترتیب زمانی اور مکانی دونوں لحاظ سے کی

ہے، مثلاً پہلے وہ بدری صحابہ پھر غیر بدری، پھر تابعین، پھر بعد کے فقہاء ومحدثین کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ مکانی ترتیب بھی ان کے پیش نظر ہے۔ مثلاً مدینہ، مکہ، شام، مصر، کوفہ، بغداد اور خراسان وغیرہ میں جو صحابہ وتابعین سکونت پذیر ہیں ان کا الگ سے تذکرہ کرتے ہیں، ان دونوں ترتیب کی وجہ سے شخصیات کے تعارف میں تکرار پیدا ہوگیا ہے، مثلاً ایک صحابی کا تذکرہ وہ عہد رسول میں بھی کرتے ہیں اور وہی صحابی کسی اور مقام پر منتقل ہوگئے تو وہاں بھی ان کا تذکرہ کرتے ہیں، مثلاً حضرت علیؓ کا تذکرہ بدریوں میں بھی ملے گا اور کوفہ کے احوال میں بھی ملے گا، اسی طرح حضرت عمرو بن العاص کا صحابہ کے ضمن میں بھی ملے گا اور نزیل مصر کے ضمن میں بھی ملے گا، امام ابوحنیفہ کا تذکرہ عام اہل علم کے ضمن میں بھی ملے گا اور بغداد کے ضمن میں بھی ملے گا بلکہ بعض صحابہ کا تذکرہ تین جگہوں پر ملے گا، ابن سعد نے اگرچہ ان اصحاب کا کہیں مفصل اور کہیں مجمل تذکرہ کیا ہے مگر اس سے کتاب میں طوالت اور تکرار پیدا ہوگئی ہے، اگر حروف تہجی کے لحاظ سے کتاب کی ترتیب ہوتی یا ایک جگہ مفصل تذکرہ کرکے باقی جگہوں پر حوالہ دینے پر اکتفا کیا جاتا تو اس اطناب سے بچا جاسکتا تھا، اسی طرح طبقات کی تقسیم کا معاملہ ہے چوتھے طبقہ کے بعض لوگ پانچویں میں آگئے ہیں اور اس کے برعکس بھی، ابن سعد نے جو طریقہ طرق اسناد ذکر کرکے مجموعی روایت بیان کرنے میں اختیار کیا تھا، اگر اس طریقہ کی پابندی اس زمانی اور مکانی ترتیب میں بھی کرتے تو بھی اولیٰ تھا۔

ابن سعد نے صحابہ اور معروف تابعین کا تذکرہ تو قدرے تفصیل مگر اپنے عہد کے اہل علم کا اختصار بلکہ بعض شخصیات کا تو ایک یا دو لفظ میں کردیا ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ صحابہ اور اجلہ تابعین کے حالات جس قدر عظمت اور اہمیت کے حامل تھے ان کو اسی قدر تفصیل سے بیان کیا جائے اور بعد کے لوگوں کے حالات میں اختصار سے کام لیا جائے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اول الذکر کے حالات بکثرت طرق اسانید سے دستیاب تھے، کتابیں بھی موجود تھیں، مگر معاصرین کے احوال پر اس طریقہ سے مواد دستیاب نہ تھا، ابن سعد گوشہ نشینی پسند کرتے تھے، معاصرین کے حالات جمع کرنے میں ممکن ہے ان کا عزلت پسندانہ مزاج حائل رہا ہو۔

طبقات ابن سعد کی پہلی اور دوسری جلد رسول اللہؐ کی سیرت سے متعلق ہے، جس کی

طرف ابن ندیم نے اشارہ کیا ہے ''وله من الكتب كتاب اخبار النبي صلى الله عليه وسلم'' (۳۱) پہلی جلد میں جو ۵۱۱ صفحات پر مشتمل ہے، ابن سعد نے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ماقبل انبیاء اور عرب کے معروف قبائل کا تذکرہ کیا ہے، پھر رسول اللہؐ کے آباء واجداد، حسب ونسب، ولادت، آپؐ کے اسماء، کنیت، ابتدائی حالات، اسفار، ازواج واولاد، بعثت وعلامات نبوت، نزول وحی، ہجرت حبشہ، محاصرۂ قریش، سفر طائف، معراج اور دعوت اسلام کی تفصیل بیان کی ہے، اس کے بعد ہجرت مدینہ، مؤاخاۃ، تحویل قبلہ، تعمیر مسجد، فرضیت صلاۃ وصوم اور بادشاہوں کے نام مراسلات کی تفصیلات ہیں، اسی جلد میں رسول کریمؐ کے پاس آنے والے تقریباً ۷۲ وفود کا بھی تفصیلی تذکرہ ہے، وفود کے متعلق اس قدر مفصل معلومات سے سیرت کی دوسری کتابیں خالی ہیں۔

اس حصہ کی اہمیت کے پیش نظر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خان نے کالج کی درسیات کے لیے فارسی میں اس کا ترجمہ مشہور مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ سے کرایا (۳۲)، اس جلد کے آخری حصہ میں آپؐ سے متعلق بشارتوں کی تفصیلات ابن سعد نے توریت اور انجیل اور شمائل، معتبر روایات کے حوالہ سے نقل کیے ہیں، اس عہد میں شمائل کی کتابیں الگ سے لکھی نہیں جاتی تھیں، اس بنا پر پروفیسر ہرووتس کا خیال ہے کہ:

> ''ابن سعد غالباً پہلا مؤلف بھی ہے، جس نے ''علامات النبوۃ'' کو یکجا کیا ہے، اس سے زمانہ مابعد میں دلائل النبوۃ جیسی کتابوں کی تالیف کی گئی، اسی طرح اس نے اپنی کتاب کی فصل ''صفۃ اخلاق رسول اللہ'' لکھ کر شمائل کے موضوع پر تصانیف کا راستہ ہموار کردیا'' (۳۳)

۳۹۹ صفحات پر محیط دوسری جلد کا بیشتر حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات و سرایا پر مشتمل ہے، اس میں ابن سعد نے غزوات کے نام، مقام، تاریخ اور غزوات میں شرکاء اور سواریوں کی تعداد وغیرہ اور رسول پاکؐ کے ۲۸ غزوات اور ۵۶ سرایا کا حال تفصیل سے لکھا ہے، کتاب کے آغاز میں انہوں نے اپنے سلسلہ سند سے یہ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کی تعداد ۲۷ اور سرایا کی تعداد ۴۷ ہے (۳۴)، مگر جو تفصیل غزوات کی انہوں نے

پیش کی ہے اس کی تعداد ۲۸ ہے اور سرایا کی تعداد ۴۷ کے بجائے ۵۶ ہے۔

ابن سعد کے استاذ واقدی کا خاص فن مغازی ہے، اس لیے ابن سعد نے اس حصہ میں اپنے استاذ کی کتاب المغازی سے پورا استفادہ کیا ہے، غزوات وسرایا کے علاوہ رسول اللہؐ کے مرض ووفات، حدیث، اس وقت کے خانگی معاملات، آپ کی وفات کے وقت صحابہ کے احوال، تجہیز وتکفین اور قبر شریف کا مفصل تذکرہ ہے، اسی طرح حضورؐ کی وراثت، قرضوں اور آپ کے وصال پر کہے گئے مرثیوں کا ذکر ہے، ابن ندیم نے واقدی کی جن کتابوں کا تذکرہ کیا ہے، ان میں وفات النبیؐ بھی ہے اور اس باب میں ابن سعد کا ماخذ وہ کتاب بھی رہی ہے، البتہ ابن سعد نے اس میں دوسری سندوں سے بہت کچھ اضافہ کیا ہے، اسی جلد میں ابن سعد نے عہد رسولؐ کے اصحاب فتاویٰ اور قرآن کو جمع کرنے والوں کے احوال لکھے ہیں نیز رسول اللہؐ کے بعد صحابہ اور تابعین میں اصحاب فتاویٰ کے بھی احوال لکھے ہیں اور اصلاً وہ طبقات سے تعلق رکھتے ہیں۔

طبقات کی تیسری جلد ۶۳۸ صفحات پر مشتمل ہے، یہ ان صحابہ کے حالات کے لیے مختص ہے جنہوں نے جنگ بدر میں حصہ لیا تھا، دراصل تیسری جلد ہی سے طبقات کا آغاز ہوتا ہے اور اسی لیے پروفیسر سخاؤ نے اسی جلد میں اپنا مقدمہ تحریر کیا ہے، یہ جلد دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ جنگ بدر میں حصہ لینے والے مہاجرین صحابہ کے حالات پر ہے، اس کا آغاز رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے ہوتا ہے اور اختتام عمر بن ابی عمرو کے حالات پر۔

دوسرا حصہ جنگ بدر میں حصہ لینے والے انصاری صحابہ کے حالات پر مشتمل ہے، اس کا آغاز حضرت سعد بن معاذؓ کے حالات سے ہوتا ہے اور اختتام حضرت عبداللہ بن خثمہ کے حالات پر ہوتا ہے، ان تمام صحابہ کو ابن سعد نے پہلے طبقہ میں رکھا ہے، طبقات کے اس حصہ میں ابن سعد نے دیگر شیوخ کے علاوہ خاص طور پر اپنے استاذ محمد بن عمر الواقدی کی کتاب المغازی اور الطبقات سے استناد کیا ہے اور چھ سوتیں روایات ان ہی کی سند سے بیان کی ہیں۔

طبقات کی چوتھی جلد جو ۳۹۲ صفحات پر مشتمل ہے، مہاجر اور انصار صحابہ سے بحث کرتی ہے اور اسے ابن سعد نے دوسرے طبقہ کا نام دیا ہے، اس کے دو حصے ہیں، پہلا حصہ ان صحابہ کے حالات میں ہے، جن کا اسلام اگرچہ قدیم تھا مگر وہ حبشہ ہجرت کرنے کے باعث جنگ بدر میں

شریک نہ ہو سکے تھے، اس میں پہلا نام حضورؐ کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب کا ہے اور دوسرا نام چچازاد بھائی جعفر بن ابی طالبؓ کا ہے، حالانکہ حضرت عباسؓ جنگ بدر میں قیدی بنائے گئے تھے اور بعد میں اسلام لائے تھے، جب کہ حضرت جعفرؓ کا اسلام قدیم ہے اور وہ مہاجرین حبشہ کے سربراہ تھے، دوسرا حصہ ان صحابہ کے حالات پر مشتمل ہے جو جنگ بدر کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے تھے، ان میں حضرت خالد بن ولیدؓ، عمرو بن العاصؓ اور عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ وغیرہ شامل ہیں۔

طبقات کی پانچویں جلد تابعین کے حالات کے لیے مختص ہے، یہ ۵۸۹ صفحات پر مشتمل ہے، اس کی ابتدا ان تابعین سے ہوتی ہے جو مدینہ میں مقیم تھے اور جنھوں نے کبارِ صحابہ مثلاً حضرت عثمانؓ، علیؓ، عبدالرحمن بن عوفؓ، طلحہ بن زبیرؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، ابی بن کعب، سہل بن حنیف اور حذیفہ بن یمان وغیرہم سے روایت کی، پھر ان مدنی تابعین کا تذکرہ ہے جنھوں نے صغار صحابہ مثلاً اسامہ بن زید، عبداللہ بن عمر، جابر بن عبداللہ، ابوسعید خدری، رافع بن خدیج، سلمہ بن اکوع، عبداللہ بن عباس اور حضرت عائشہؓ وغیرہم سے روایت کی، اس میں انصار اور موالی وغیرہ کا بھی تذکرہ ہے، اس حصہ کو ابن سعد نے سات طبقات میں تقسیم کیا ہے، اسی جلد میں مکہ میں قیام کرنے والے صحابہ اور تابعین کا بھی تذکرہ ہے اور اس حصہ کو انھوں نے پانچ طبقات میں تقسیم کیا ہے، اسی جلد میں طائف، یمن، یمامہ اور بحرین میں سکونت اختیار کرنے والے صحابہ و تابعین اور مابعد کے فقہاء اور محدثین کا تذکرہ ہے۔

طبقات کی چھٹی جلد جو ۴۴۱ صفحات پر مشتمل ہے، ان صحابہ اور تابعین اور فقہاء و محدثین کے لیے خاص ہے جنھوں نے کوفہ میں سکونت اختیار کر لی تھی، اس جلد کی ابتدا میں علی بن ابی طالبؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، سعید بن زیدؓ، عمار بن یاسرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، خباب بن الارتؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ اور سلمان فارسیؓ وغیرہ کا تذکرہ ہے، پھر صحابہ سے روایت کرنے والے تابعین کا تذکرہ ہے جن کو ابن سعد نے ۹ طبقات میں تقسیم کیا ہے۔

کتاب کی ساتویں جلد جو ۵۵۴ صفحات پر مشتمل ہے، ان صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور مابعد کے فقہاء، محدثین اور اہل علم کے حالات پر مشتمل ہے جو بصرہ، واسط، مدائن، بغداد، خراسان،

رے، ہمدان، قم، انبار، شام، جزیرہ، مصر، ایلہ، افریقہ اور اندلس میں سکونت پذیر ہوئے، اسی جلد میں محمد بن سعد صاحب طبقات کا بھی تذکرہ ہے جو ظاہر ہے ان کے شاگرد نے تحریر کیا ہے۔

آٹھویں جلد جو ۵۱۷ صفحات پر مشتمل ہے، خواتین اسلام کے لیے مخصوص ہے، اس میں ۶۲۸ صحابیات و تابعات کا تذکرہ ہے، خاص طور سے خاندان رسول کی خواتین، حضورؐ سے بیعت کرنے والی، ہجرت کرنے والی، انصار، حضورؐ اور ان کی ازواج سے روایت کرنے والی خواتین کے احوال درج ہیں۔

ابن سعد سے روایت کرنے والے: محمد بن سعد کے بہت سے تلامذہ ہیں، جن میں حسب ذیل معروف ہیں:

۱۔ احمد بن عبید۔　۲۔ ابن ابی الدنیا۔　۳۔ البلاذری۔　۴۔ حارث بن ابی اسامہ۔　۵۔ حسین بن فہم وغیرہ۔

ان میں آخر الذکر دو تلامذہ نے طبقات کی روایت کی ہے، ایک نے بعض حصہ کی اور دوسرے نے بعض حصہ کی، اس طرح طبقات مکمل شکل میں سامنے آئی ہے، پھر حارث بن ابی اسامہ سے ابوایوب سلیمان بن اسحق الحلاب نے روایت کی اور ابن فہم سے ابوالحسن احمد بن معروف الخشاب نے روایت کی، پھر یہ دونوں روایتیں ابوالحسن ابن حیویہ الخزاز کے پاس مجتمع ہوئیں اور پھر تسلسل کے ساتھ اس کی روایت ہوتی رہی، یہاں تک کہ شام کے محدث شمس الدین ابوالحجاج یوسف بن خلیل دمشقی کے پاس آئی اور ان سے شرف الدین محمد بن عبدالمومن دمیاطی کے پاس پہنچی۔ (۳۵)

ابن سعد کے شیوخ: ابن سعد نے طبقات میں بہت سے شیوخ سے روایت نقل کی ہے، ان شیوخ میں حسب ذیل حضرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

۱۔ سفیان بن عیینہ۔　۲۔ ابوالولید الطیالسی۔　۳۔ محمد بن سعدان الضریر۔
۴۔ وکیع بن الجراح　۵۔ سلیمان بن حرب۔　۶۔ هشیم بن بشیر۔
۷۔ الفضل بن دکین۔　۸۔ ولید بن مسلم　۹۔ معن بن عیسیٰ۔
۱۰۔ ابومعشر نجیح۔　۱۱۔ ہشام بن محمد بن السائب الکلبی۔　۱۲۔ محمد بن عمر الواقدی الاسلمی۔

ان میں سے بیشتر شیوخ ثقہ ہیں اور محدثین واصولیین نے ان کی تعدیل کی ہے، لیکن آخر الذکر تین شیوخ پر محدثین نے کلام کیا ہے اور ان کی تضعیف کی ہے مگر ابن سعد نے نہ صرف ان سے روایت کی ہے بلکہ طبقات کی ابتدائی تین جلدوں میں جو سیرت رسول اور سیرت صحابہ پر مبنی ہیں، ان تینوں شیوخ کی روایات بکثرت پائی جاتی ہیں، ابو معشر نجیح السندی م ۱۷۰ھ کی روایت ابن سعد اور واقدی دونوں نے قبول کی ہے، تاریخ و سیر بالخصوص مغازی میں ان کا علم معروف ہے مگر روایت حدیث میں محدثین نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے، امام بخاری کہتے ہیں کہ ان کی حدیث سے اختلاف کیا جاتا ہے، ابوداؤد نے کہا ہے کہ ان کے پاس منکر احادیث ہیں، امام ترمذی نے کہا ہے کہ اہل علم نے ان کے حافظہ کے بارے میں کلام کیا ہے، دار قطنی نے بھی ان کو ضعیف قرار دیا ہے۔(۳۶)

محمد بن سعد نے خود بھی ان کے بارے میں لکھا ہے کہ "کان کثیر الحدیث ضعیفا" (۳۷) ان کی احادیث تو بہت ہیں مگر ضعیف ہیں، اس کے باوجود انہوں نے الطبقات میں ابو معشر کی روایت کو قبول کیا ہے، غالباً تاریخ و سیر و مغازی میں ابو معشر کی وسیع معلومات کے پیش نظر ابن سعد نے روایت میں ان کے ضعف کو نظر انداز کر دیا ہے یا ان روایات کو قبول کیا ہے جو دوسرے طرق سے بھی مروی ہیں، اسی کے ساتھ ابن سعد نے ابو معشر کی مرویات پر نقد و جرح بھی کیا ہے، مثلاً بدری صحابی حضرت سواد بن رزن بن زید بن ثعلبہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ موسیٰ بن عقبہ نے کہا کہ وہ اسود بن رزن بن ثعلبہ ہیں، انہوں نے زید کا تذکرہ نہیں کیا، محمد بن اسحٰق اور ابو معشر نے کہا ہے کہ وہ سواد بن زریق بن ثعلبہ ہیں، وھذا عندنا تصحیف من رواتھم اور میرے نزدیک یہ ان کے رواۃ کی تصحیف ہے۔(۳۸)

اسی طرح ابو حنہ مالک بن عمرو بن ثابت بن کلفۃ دوسرے بدری صحابی ہیں، ان کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ محمد بن اسحٰق اور ابو معشر نے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ ابوحبہ ہیں، پھر انہوں نے محمد بن عمر واقدی کے حوالہ سے اس قول کو رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ولیس فیمن شھد بدرا احد یکنی ابا حبہ" جنگ بدر میں جو صحابہ شریک تھے ان میں سے کسی کی کنیت ابوحبہ نہیں تھی۔"(۳۹)

ابن سعد نے ہشام بن السائب الکلبی م ۲۰۴ھ سے بھی روایت کی ہے، زمانہ ماقبل اسلام بالخصوص اہل کتاب کے کوائف کے بارے میں ابن سعد کا بڑا ماخذ کلبی کی روایات ہیں، حالانکہ ہشام الکلبی کے بارے میں محدثین کی رائے اچھی نہیں ہے، بعض نے انہیں دروغ گو اور رافضیت سے متہم بتایا ہے (۴۰)، ابن سعد ان کی اس کمزوری سے واقف ہیں پھر بھی ان سے روایت کرتے ہیں، غالباً تاریخ و سیر اور انساب میں ان کی مسلمہ قابلیت کے پیش نظر وہ ان کو نظر انداز نہیں کرتے، البتہ جابجا ان کی مرویات کی چھان پھٹک بھی کرتے ہیں، یعنی کلبی پر مکمل انحصار نہیں کیا ہے، دوسرے مآخذ سے بھی مدد لی ہے اور جہاں کلبی کی روایات میں سقم نظر آیا ہے، اس پر گرفت بھی کی ہے، مثلاً انہوں نے ہشام الکلبی کی یہ روایت بیان کی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کا جب انتقال ہوا تو حضورؐ کی عمر ۲۸ ماہ تھی، بعض نے سات ماہ کہا ہے، اس پر ابن سعد نے نقد کرتے ہوئے لکھا ہے:

والاول أثبت أنه توفي و رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم حمل۔(۴۱)

پہلی روایت زیادہ ثابت ہے کہ والد کے انتقال کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطن مادر میں تھے۔

اسی طرح ہشام الکلبی سے انہوں نے یہ روایت بیان کی ہے کہ جنگ بدر میں السائب بن مظعون شریک ہوئے تھے جو عثمان بن مظعون کے بھائی تھے نہ کہ سائب بن عثمان، اس روایت پر جرح کرتے ہوئے ابن سعد نے لکھا ہے:

وذالك عندنا وهل لان اصحاب السيرة ومن يعلم المغازی يتبتون السائب بن عثمان بن مظعون فيمن شهد بدرا احد والخندق والمشاهد كلها مع رسول الله صلى الله عليه وسلم ۔(۴۲)

ہماری رائے میں ہشام سے چوک ہوئی ہے، اس لیے کہ اصحاب سیرت اور جو لوگ مغازی کا علم رکھتے ہیں، وہ سب ثابت کرتے ہیں کہ السائب بن عثمان بن مظعون ہی جنگ بدر، جنگ احد، جنگ خندق اور دیگر تمام غزوات میں رسول اللہؐ کے ساتھ شریک ہوئے تھے، ہشام السائب الکلبی نے اپنے والد کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ جاریہ بن حمیل بن نشبۃ جنگ بدر میں

شریک ہوئے تھے، اس پر ابن سعد نے نقد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''علماء میں سے کسی نے جنگ بدر میں ان کی شرکت کا تذکرہ نہیں کیا ہے اور نہ یہ میرے نزدیک ثابت ہے۔(۴۳)

بعض مقامات پر کلبی کی روایت نقل کی ہے اور اس کی دوسری سند بھی بیان نہیں کی ہے اور نہ کسی نقد وتبصرہ سے کام لیا ہے، بعد کے سیرت نگاروں میں علامہ حافظ ابن کثیر نے بھی البدایہ والنہایہ میں ہشام الکلبی کی بکثرت روایات نقل کی ہیں، حالاں کہ ابن کثیر کا تفسیر اور حدیث میں جو مقام ہے وہ اہل علم سے مخفی نہیں، اس کے باوجود وہ ہشام السائب الکلبی سے روایت کرتے ہیں۔

ابن سعد کے بعد تیسرے اور سب سے اہم شیخ ان کے استاذ محمد بن عمر الاسلمی الواقدی ہیں، ماقبل اسلام کے حالات کے بارے میں ابن سعد واقدی سے نسبتاً کم روایت کرتے ہیں جب کہ مدنی دور کے واقعات بالخصوص مغازی کے سلسلہ میں ان کا سب سے بڑا ماخذ واقدی کی مرویات ہیں، چوں کہ ابن سعد واقدی کے شاگرد رشید ہی نہیں ان کے کاتب بھی تھے، اس لیے ان کی علمی وراثت کا بڑا حصہ واقدی پر مبنی ہے اور بقول علامہ شبلی نعمانی ''ابن سعد کی نصف سے زیادہ روایتیں واقدی کے ذریعہ سے ہیں، اس لیے ان روایتوں کا وہی رتبہ ہے جو واقدی کی روایتوں کا ہے''۔(۴۴)

دوسری جگہ لکھتے ہیں ''سیرت میں اگلوں نے جو کتابیں لکھیں ان سے مابعد کے لوگوں نے جو روایتیں نقل کیں، ان ہی کے نام سے نقل کیں، ان کے مستند ہونے کی بنا پر لوگوں نے ان تمام روایتوں کو معتبر سمجھ لیا اور چوں کہ اصل کتابیں ہر شخص کو ہاتھ نہیں آسکتی تھیں، اس لیے راویوں کا پتہ نہ لگا سکے'' اور رفتہ رفتہ یہ روایتیں تمام کتابوں میں داخل ہوگئیں، اس تدلیس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مثلاً جو روایتیں واقدی کی کتاب میں مذکور ہیں، ان کو لوگ عموماً غلط سمجھتے ہیں لیکن ان ہی روایتوں کو جب ابن سعد کے حوالہ سے نقل کردیا جاتا ہے تو لوگ ان کو معتبر سمجھتے ہیں، حالاں کہ ابن سعد کی کتاب ہاتھ آئی تو پتہ لگا کہ ابن سعد نے اکثر روایتیں واقدی ہی سے لی ہیں۔(۴۵)

محدثین نے واقدی کو متروک اور ضعیف قرار دیا ہے مگر مغازی کے باب میں ان کے علم وفضل کا اعتراف بھی کیا ہے، چنانچہ امام ابن تیمیہ نے واقدی کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

مع مافی الواقدی من الضعیف،لایختلف اثنان ان الواقدی اعلم الناس بتفاصیل امور المغازی واخبر باحوالها وقد کان الشافعی وأحمد وغیرهما یستفیدون علم ذالك من کتبه ۔(۴۶)

اگرچہ واقدی ضعیف ہے مگر دو آدمی بھی اس سلسلہ میں مختلف الرائے نہیں کہ واقدی امور مغازی اور اس کے احوال کی تفصیلات کے بارے میں سب لوگوں سے زیادہ علم والے تھے اور امام شافعی اور امام احمد بن حنبل وغیرہ ان کی کتابوں سے استفادہ کرتے تھے۔

علامہ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے:

والواقدی عنده زیارات حسنة وتاریخ محرر غالبا فانه من ائمة هذا الشان الکبار وهو صدوق فی نفسه مکثار۔(۴۷)

واقدی کے پاس عمدہ چیزیں ہیں اور غالباً لکھی ہوئی تاریخ ہے، وہ اس شان (یعنی مغازی) کے بڑے اماموں میں سے ہیں اور فی نفسہ صادق ہیں، کثیر الروایۃ ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ ابن سعد کے شاگرد ابن فہم کا بیان ہے کہ مصعب الزبیری کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ہمارے پاس یحییٰ بن معین آئے تو مصعب الزبیری نے ان سے کہا، اے ابوزکریا! ہم سے محمد بن سعد الکاتب نے فلاں فلاں روایت بیان کی ، یہ سن کر یحییٰ بن معین نے کہا '' کذب '' وہ جھوٹ بولا۔(۴۸)

یحییٰ بن معین کا علم حدیث میں بڑا مرتبہ ہے، ان کا ابن سعد کی طرف کذب منسوب کرنا بڑی بات اور ابن سعد کے مقام پر منفی تبصرہ ہے، یحییٰ ابن معین کے علاوہ ہم کوئی دوسرا محدث نہیں پاتے جس نے اس قسم کا تبصرہ کیا ہو، محدث خطیب بغدادی نے اس تبصرہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

أظن مصعبا ذکر یحیی منه حدیثا من المناکیر التی یرویها الواقدی ۔(۴۹)

میں سمجھتا ہوں کہ مصعب نے یحییٰ بن معین کو ابن سعد کے حوالہ سے وہ منکر روایات سنائی تھیں، جن کو واقدی بیان کرتے تھے۔

گویا واقدی کے بارے میں جو رائے تھی وہی رائے یحییٰ ابن معین نے ابن سعد کے

بارے میں ظاہر کی ورنہ عام طور پر محدثین ان کو ثقہ کہتے ہیں اوران کی مرویات کو قابل قبول سمجھتے ہیں، ابن سعد گو کہ واقدی کے شاگرد رشید اور کاتب ہیں اور بقول ابن ندیم کے اپنی کتاب کی اساس انہوں نے واقدی کی مصنفات پر رکھی ہے۔

روی عنه والف کتبه من تصنيفات الواقدی ۔(۵۰)	ابن سعد نے واقدی سے روایت کی اور اپنی کتابوں کو واقدی کی تصنیفات سے اخذ کیا۔

مگر ابن سعد اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ ان کے استاذ کے بارے میں محدثین کی رائے منفی ہے لہٰذا انہوں نے واقدی کی مرویات کو آنکھ بند کر کے قبول نہیں کیا بلکہ غور و فکر کے ساتھ کیا ہے اور دوسرے رواۃ کے طریقوں سے بھی استفادہ کیا ہے، چنانچہ خطیب بغدادی کی یہ شہادت بہت ہی معنیٰ خیز ہے کہ:

أنه يتحری فی کثیرمن روایاته(۵۱)	وہ اپنی اکثر روایات کی چھان پھٹک کرتے تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ابن ندیم اور علامہ شبلی کے بشمول جملہ تذکرہ نگاروں نے اس تبصرہ میں مبالغہ سے کام لیا ہے کہ ابن سعد نے طبقات کی زیادہ تر مرویات واقدی سے لی ہیں، اگر طبقات کی کل مرویات کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ واقدی کی مرویات ۱۷ فیصد سے زیادہ نہیں ہیں، کیونکہ الطبقات کی کل مرویات کی تعداد گیارہ ہزار آٹھ سو پندرہ ہے جن میں دو ہزار دو سو ننانوے واقدی کے حوالہ سے ہیں، بقیہ دیگر شیوخ سے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جن حضرات نے واقدی کی روایات کو نظر انداز کیا ہے اور اپنی کتب سیرت میں براہ راست ان کا حوالہ دینا مناسب نہیں سمجھا، انہوں نے ابن سعد کی روایات کو قبول کیا ہے، اپنی کتابوں میں ان کا حوالہ دیا ہے بلکہ واقدی کی روایات کو ابن سعد کے حوالہ سے قبول کیا، ابن سعد کی مرویات کو اپنی کتب میں قبول کرنے والوں میں بڑے نامور سیرت نگار شامل ہیں، جن میں چند یہ ہیں:

۱۔ ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں۔ ۲۔ اصفہانی نے دلائل النبوۃ اور حلیۃ الاولیاء میں۔ ۳۔ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں۔ ۴۔ ابن اثیر جزری نے اسد الغابہ میں۔ ۵۔ بیہقی نے سنن کبریٰ میں۔ ۶۔ طبری نے تاریخ اسلام میں۔ ۷۔ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ اور تاریخ

الاسلام میں۔ ۸۔ ابن حجر عسقلانی نے الاصابہ فی تمیز الصحابہ میں۔ ۹۔ ابن عساکر نے تاریخ مدینہ ودمشق میں۔ ۱۰۔ شیخ علی المتقی (۹۷۵ھ) برہان پوری نے کنز العمال میں۔

علامہ شبلی نعمانی نے واقدی کے بارے میں نہایت سخت موقف اختیار کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ:

> ''امام شافعی فرماتے ہیں کہ واقدی کی تمام تصانیف جھوٹ کا انبار ہے، کتب سیرت کی اکثر بیہودہ روایتوں کا سرچشمہ انہی کی تصانیف ہیں۔'' (۵۲)

مگر ابن سعد کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''واقدی خود تو قابل ذکر نہیں لیکن ان کے تلامذہ خاص میں سے ابن سعد نے آنحضرت ﷺ اور صحابہ کے حالات میں ایسی جامع اور مفصل کتاب لکھی ہے کہ آج تک اس کا جواب نہ ہوسکا، ابن سعد مشہور محدث ہیں، محدثین نے عموماً لکھا ہے کہ گو ان کے استاذ (واقدی) قابل اعتبار نہیں لیکن وہ خود قابل سند ہیں۔'' (۵۳)

علامہ شبلی ابن سعد اور ان کی طبقات سے اس قدر متاثر ہیں کہ ان کی کتاب سیرت النبیؐ میں سب سے زیادہ حوالے اور اقتباسات اسی کتاب کے ملتے ہیں، انہوں نے طبقات ابن سعد کے ۱۱۴ حوالے دیے ہیں (۵۴) اتنے حوالے کسی اور کتاب سیرت کے سیرۃ النبی میں نہیں ملتے، علاوہ ازیں علامہ شبلی نے بلا حوالہ بھی ابن سعد سے بہت استفادہ کیا ہے، خاص بات یہ ہے کہ ان میں سے بہت سے حوالے وہ ہیں جو براہ راست واقدی کی روایت کے ہیں، مثال کے طور پر چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

۱- علامہ شبلی نعمانی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ میں تم سب سے فصیح تر ہوں، قریشی ہوں اور میری زبان بنی سعد کی ہے (۵۵)، مولانا نے یہ روایت ابن سعد کے حوالہ سے درج کی ہے اور ابن سعد نے اسے واقدی کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ (۵۶)

۲- حضرت آمنہ کا سفر مدینہ اور ابوا میں ان کی وفات کی تفصیل (۵۷) علامہ کی نقل کردہ تمام تفصیلات ابن سعد نے واقدی کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ (۵۸)

۳- حبشہ کی طرف مسلمانوں کی دوبارہ ہجرت کے لیے علامہ نے ابن سعد کا حوالہ دیا ہے(۵۹) جب کہ ابن سعد کا ماخذ واقدی ہیں۔(۶۰)

۴- طائف کے سفر سے واپسی پر مکہ میں مطعم بن عدی کے جوار میں آنے کا واقعہ علامہ شبلی نے طبقات ابن سعد کے حوالہ سے بیان کیا ہے(۶۱)، جب کہ ابن سعد کا ماخذ واقدی ہیں(۶۲)۔

۵- ہجرت مدینہ کے مقدس سفر کی منزلیں جو رسول اکرمؐ نے طے فرمائیں، اس کے لیے مولانا شبلی نے ابن سعد کا حوالہ دیا ہے(۶۳)، جب کہ ابن سعد کا ماخذ واقدی ہیں(۶۴)۔

۶- قبا میں بنوعمرو بن عوف میں قیام کا واقعہ اور یہ کہ اکثر اکابر صحابہ جو آنحضرتؐ سے پہلے مدینہ آچکے تھے، وہ بھی انہی کلثوم بن ہدم کے گھر اترے تھے، مولانا نے ابن سعد کا حوالہ دیا ہے(۶۵)، جب کہ ابن سعد کا ماخذ واقدی ہیں(۶۶)۔

۷- مدینہ میں آکر رسول پاکؐ نے حضرت زید اور اپنے غلام ابورافع کو دو اونٹ اور پانچ سو درہم دے کر بھیجا کہ مکہ جاکر صاحب زادیوں اور حرم نبوی کو لے آئیں، مولانا نے ابن سعد کا حوالہ دیا ہے(۶۷)، جب کہ ابن سعد کا ماخذ واقدی ہیں(۶۸)۔

۸- سریہ ابی سلمہ کی تاریخ اور دوسری تفصیلات کے لیے مولانا شبلی نے ابن سعد کا حوالہ دیا ہے(۶۹) مگر ابن سعد کی روایت واقدی پر مبنی ہے(۷۰)۔

۹- غزوہ بنی قینقاع کے ضمن میں مولانا نے لکھا ہے کہ قبائل عرب میں سب سے زیادہ جری اور بہادر قینقاع تھے، مولانا نے ابن سعد کا حوالہ دیا ہے(۷۱)، جب کہ ابن سعد کا ماخذ واقدی ہیں(۷۲)۔

۱۰- غزوہ بنی المصطلق کا سبب، تاریخ، مقتولین کی تعداد اور مال غنیمت کی تفصیلات وغیرہ کے لیے مولانا نے ابن سعد کا حوالہ دیا ہے(۷۳) مگر ابن سعد کا ماخذ واقدی ہیں(۷۴)۔

پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے ان روایات کا مفصل جائزہ لیا ہے جو سیرت النبی میں طبقات ابن سعد کے حوالہ سے آئی ہیں اور ان کا ماخذ واقدی کی روایات ہیں(۷۵)۔

حضرت ام حبیبہؓ کی شادی کے سلسلہ میں ابن سعد کا بیان ہے کہ ام حبیبہ اپنے شوہر عبیداللہ بن جحش کے ساتھ حبشہ ہجرت کر گئی تھیں، ان کے شوہر وہاں جاکر مرتد ہوگئے اور اسی

حالت میں ان کا انتقال ہوگیا تو رسول پاکؐ نے عمرو بن امیہ الضمری کو نجاشی کے پاس بھیجا کہ وہ حضورؐ سے ان کا نکاح کردیں، چنانچہ نجاشی نے ان کا نکاح کردیا اور رسول پاکؐ کی طرف سے اپنے پاس سے چار سو دینار مہر کے ادا کیے (۷۶)۔

اس کے بالمقابل امام مسلم نے روایت بیان کی ہے کہ ابوسفیان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میں ام حبیبہ کو آپ کے عقد نکاح میں دیتا ہوں (۷۷)۔

سب جانتے ہیں کہ ابوسفیان فتح مکہ تک اسلام نہیں لائے تھے، اس لیے حضورؐ کی زوجیت میں اپنی صاحب زادی کو پیش کرنا جو مسلمان ہوکر حبشہ ہجرت کرگئی تھیں بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے، چنانچہ تمام اصحاب سیر نے اول الذکر روایت کو قبول کیا ہے، علامہ شبلی بھی انہی میں سے ہیں (۷۸)۔

غزوہ بنی المصطلق کے بارے میں ابن سعد کے حوالہ سے مولانا شبلی نے تفصیلی احوال لکھا ہے اور لکھا ہے کہ ۲ رشعبان کو فوجیں مدینہ سے روانہ ہوئیں، مریسیع میں خبر پہنچی تو حارث کی جمعیت منتشر ہوگئی اور وہ خود بھی کسی طرف بھاگ نکل گیا، لیکن مریسیع میں جو لوگ آباد تھے انہوں نے صف آرائی کی اور دیر تک جم کر تیر برساتے رہے، اس پر مولانا نے یہ تبصرہ کیا:

> "یہ ابن سعد کی روایت ہے، صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو المصطلق پر اس حالت میں حملہ کیا کہ وہ بالکل بے خبر اور غافل تھے اور اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے"۔ (۷۹)

مولانا دونوں روایتوں پر محاکمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ابن سعد نے اس روایت کو بھی نقل کیا ہے لیکن لکھا ہے کہ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے، اس پر حافظ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ صحیحین کی روایت پر سیرت کی روایتوں کو ترجیح نہیں ہوسکتی لیکن یہ واقعہ ہے کہ صحیحین کی روایت بھی اصول حدیث کی رو سے قابل حجت نہیں کہ اس روایت کا سلسلہ نافع تک پہنچ کر ختم ہوجاتا ہے اور جنگ میں شریک ہونا تو ایک طرف، نافع نے آنحضرتؐ کو دیکھا بھی نہ تھا، اس لیے یہ روایت اصطلاح محدثین میں منقطع ہے"۔ (۸۰)

واضح رہے کہ روایت منقطع نہیں ہے بلکہ حضرت عبداللہ بن عمر سے موصولاً مروی ہے اور

وہ اس جنگ میں شریک تھے، چنانچہ مولانا شبلی کی رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ ''معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے صرف آغاز سند کو ملاحظہ فرما کر اس روایت کو منقطع قرار دیا ہے، ورنہ متن حدیث کے بعد تصریح ہے کہ ''حدثنی هذاالحدیث عبدالله بن عمر وکان ذالك فی الجیش''۔(۸۱)

طبقات ابن سعد پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ اس میں صحیح روایات کے ساتھ ضعیف، منکر بلکہ موضوع روایات کا بھی سہارا لیا گیا ہے، علامہ شبلی نعمانی رقم طراز ہیں:

''ابن سعد اور طبری میں کسی کو کلام نہیں لیکن افسوس ہے کہ ان لوگوں کا مستند ہونا ان کی تصنیفات کے مستند ہونے پر چنداں اثر نہیں ڈالتا، یہ لوگ خود شریک واقعہ نہیں، اس لیے جو کچھ بیان کرتے ہیں اور راویوں کے ذریعہ بیان کرتے ہیں لیکن ان کے بہت سے رواۃ ضعیف الروایۃ اور غیر مستند ہیں''۔(۸۲)

مولانا حکیم عبدالرؤف داناپوری صاحب اصح السیر نے لکھا ہے کہ:

''ابن سعد کی اکثر روایتوں کو متاخرین نے نقل کیا ہے مگر ان کی مہملات کو کسی نے نہیں لکھا، میں یقین کے ساتھ یہ تو نہیں کہہ سکتا یہ یورپ کا الحاق ہے، اس لیے طبقات ابن سعد خود ایسی کوئی کتاب نہیں جس کی ساری روایتیں قابل قبول ہوں''۔(۸۳)

بعض ناقدین نے طبقات ابن سعد پر موضوع روایت کو شامل کرنے کا بھی الزام عائد کیا ہے، چنانچہ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''اس کتاب میں بہت سی موضوع روایات بھی داخل ہوگئی ہیں اور ایسا ہر اس کتاب میں ہونا فطری بات ہے جن کی بنیاد زبانی روایات پر رکھی گئی ہو''۔(۸۴)

طبقات ابن سعد میں موضوع روایات تو شاذ و نادر ہی ہیں، ابن سعد خود محدث ہیں، موضوعات بیان کرنے پر رسول اللہؐ نے جو وعید فرمائی ہے اس سے کما حقہ واقف ہیں، وہ جان بوجھ کر موضوع روایت اپنی کتاب میں درج کیسے کر سکتے ہیں، یہ ممکن ہے کہ بعض وہ روایات جن میں شدت ضعف ہو، درج ہوئی ہوں اور ان کو بعض محدثین نے موضوع قرار دیا ہو اور ایسا اکثر ہوتا ہے

کہ ایک حدیث بعض محدثین کے نزدیک ضعیف ہے اور بعض نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔

ضعیف اور موضوع روایت کو ایک خانہ میں رکھنا خلط مبحث ہے اور ہمارے عہد میں یہ کام علامہ ناصر الدین البانی نے ''سلسلة الاحادیث الضعیفة والموضوعة'' لکھ کر کیا گیا ہے، طبقات میں ضعیف روایات کا پایا جانا کوئی مستبعد نہیں، سیرت کی کوئی کتاب، خواہ وہ متقدمین کی ہو یا متاخرین کی، ضعیف روایات سے خالی نہیں اور اسی لیے حافظ زین الدین عراقی کو یہ کہنا پڑا کہ ؎

ولیعلم الطالب ان السیرا تجمع ماصح وماقدانکرا

طالب علموں کو معلوم ہونا چاہیے کہ سیرت کی کتابوں میں صحیح اور منکر ہر طرح کی روایات موجود ہیں اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ محدثین احکام کی روایات میں جس طرح چھان بین کرتے ہیں، حزم و احتیاط سے کام لیتے ہیں اور روایت و درایت کی کسوٹی پر رکھ کر ردّ و قبول کا معیار قائم کرتے ہیں، اتنی سختی وہ فضائل کے باب میں نہیں کرتے، اسی لیے سیرت کی کتابیں تو ایک طرف، خود احادیث و سنن کے معتبر مجموعوں میں ضعیف بلکہ موضوع روایات کی مثالیں مل جاتی ہیں، علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ ''غور کرو ابونعیم، خطیب بغدادی، ابن عساکر، حافظ عبدالغنی وغیرہ حدیث اور روایت کے امام تھے، باوجود اس کے یہ لوگ خلفاء اور صحابہ کے فضائل میں ضعیف حدیثیں بے تکلف روایت کرتے تھے، اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ خیال عام طور پر پھیل گیا تھا کہ صرف حلال و حرام کی حدیثوں میں احتیاط اور تشدد کی ضرورت ہے اور ان کے سوا اور روایتوں میں سلسلۂ سند نقل کر دینا کافی ہے، تنقید اور تحقیق کی ضرورت نہیں''۔ (۸۵)

صحاح ستہ میں ابن ماجہ شمار کی جاتی ہیں مگر اس میں ہر طرح کی صحیح اور ضعیف روایات موجود ہیں، مولانا عبدالرشید نعمانی نے ابن ماجہ کی ۱۱۱۸ احادیث کو ضعیف یا موضوع قرار دیا ہے۔

امام بخاری اور امام مسلم کا بڑا مرتبہ ہے اور امت میں ان کو قبول عام حاصل ہے مگر جن روایات کو انہوں نے صحیح یا ضعیف قرار دیا ہے وہ ان کے اجتہاد پر مبنی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کی کتابوں کے استدراکات لکھنے کی محدثوں کو ضرورت ہی پیش نہ آتی اور نہ ان کتابوں پر تعقبات لکھی جاتیں، اگرچہ صحیحین میں کمزور روایات نہایت قلیل ہیں۔

حدیث و سنن کی مذکورہ کتابوں کا مرتبہ کم کرنے کا سوال ہرگز نہیں، سوال انسانی کوششوں

کی کوتاہی اور فروگذاشت کا ہے، ہزار کوششوں کے بعد بھی اس طرح کی کمزوریاں باقی رہنا فطری امر ہے، بقول ذوقؔ ؎

افراط سے خالی کوئی انسان نہیں ہے　　یہ ذوقؔ کا دیوان ہے قرآن نہیں ہے

طبقات میں جو ضعیف روایات پائی جاتی ہیں ان میں سے بعض کی طرف اہل علم نے نشان دہی کی ہے، مثلاً ابن سعد نے حضرت خباب بن الارت کے حالات میں احمد بن عبداللہ بن یونس بن حیان سے علی عن مجالد عن الشعبی کے طریق سے روایت کی ہے کہ حضرت خباب حضرت عمرؓ کے پاس تشریف لائے، حضرت عمرؓ نے ان کو ٹیک لگانے والی جگہ پر بٹھایا اور کہا کہ اس جگہ پر بیٹھنے کا حق دار اس زمین میں ایک ہی شخص ہے، حضرت خباب نے پوچھا وہ کون ہیں؟ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا حضرت بلال، تو حضرت خباب نے فرمایا، امیر المومنین! حضرت بلال مجھ سے زیادہ مستحق نہیں ہوسکتے کیونکہ مشرکین میں ایسے لوگ تھے جو بلال کے حمایتی تھے مگر میرے لیے کوئی نہ تھا، ایک دن مشرکوں نے مجھے پکڑلیا اور میری پیٹھ کے نیچے آگ سلگادی، مجھے اس پر لٹادیا اور ایک شخص میرے سینے پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہوگیا، یہاں تک کہ زمین پر آگ میری پیٹھ کی وجہ سے بجھ گئی، پھر انہوں نے اپنی پیٹھ کھول کر دکھادی تو جلنے کی وجہ سے پیٹھ برص کے مانند سفید ہوچکی تھی۔ (۸۶)

یہ روایت محدثین کے نزدیک ضعیف ہے کیوں کہ اس کی سند میں حبان بن علی اور مجالد دو راوی ہیں اور دونوں ضعیف ہیں، مزید برآں یہ روایت شعبی پر جاکر ختم ہوجاتی ہے۔

طبقات ابن سعد مطبوعہ شکل میں: طبقات ابن سعد عرصہ دراز تک کمیاب تھی، اس کا مکمل نسخہ نہیں دستیاب تھا، جرمن مستشرق پروفیسر سخاؤ (E.Sachau) کی سربراہی میں ایک ٹیم نے ۱۹۰۳ء میں اس کے پانچ مخطوطات کو جمع کیا، ان کا باہم موازنہ کیا اور ایک مکمل نسخہ تیار کیا، اس کی تحقیق وتخریج اور طباعت میں بیس سال کا عرصہ صرف ہوا اور پانچ سالوں میں اس کی طباعت مکمل ہوئی، پہلی بار ہالینڈ سے ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی، اس کے بعد بیروت اور دیگر مقامات سے اس کے ایڈیشن شائع ہوئے۔

راقم نے جس ایڈیشن کو سامنے رکھا ہے، وہ بیروت سے ۱۹۶۰ء میں طبع ہوا ہے اور آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد کے آغاز میں محمد بن سعد اور الطبقات کے بارے میں ڈاکٹر احسان عباس کا تعارفی مقدمہ ہے۔

جرمن مستشرق اوٹولوت نے الطبقات کے بارے میں ایک رسالہ ۱۸۶۹ء میں لکھا تھا اور پروفیسر سخاو نے کتاب کا تجزیاتی مطالعہ کیا تھا جو الطبقات کی تیسری جلد میں بطور مقدمہ شامل ہے، اس کتاب پر ایک تبصرہ جرمن پروفیسر جوزف ہوروتس سابق پروفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کیا تھا (۸۷)۔

اس کتاب کی ایڈیٹنگ اور طباعت چوں کہ عیسائی مستشرقین کے ذریعہ عمل میں آئی ہے، اس لیے بعض اہل علم نے اصل کتاب میں حذف و اضافہ کا شبہ ظاہر کیا ہے، اصح السیر کے مصنف مولانا عبدالروف داناپوری نے لکھا ہے:

"طبقات ابن سعد عرصہ سے مفقود تھی، مسلمانوں کے پاس اس کا مکمل نسخہ کہیں بھی موجود نہیں تھا، اب یورپ کے عیسائیوں نے اسے چھپوایا ہے اور وہی میرے پیش نظر ہے مگر اس کی کوئی سند نہیں کہ یہ نسخہ اصل تصنیف کے موافق ہے"۔ (۸۸)

ایک دوسرے فاضل مولانا ندیم الواجدی نے لکھا کہ:

"کتاب میں بعض بے اصل چیزیں بھی موجود ہیں، خیال ہے کہ ان مواقع پر عیسائیوں نے اسلام کے خلاف اپنی پرانی عداوت کا اظہار کیا ہے"۔ (۸۹)

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ مولانا موصوف نے مخطوطہ و مطبوعہ نسخہ میں موازنہ کرنے کے بجائے صاحب اصح السیر کے بیان پر اعتماد کر کے مذکورہ بدگمانی کا اظہار کیا ہے، خود اصح السیر کے مصنف نے بھی مطبوعہ نسخہ کو اصل سے مقابلہ و موازنہ کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی، اس لیے ان کا اشکال بھی ناقابل توجہ ہے، اس سے قاری کے ذہن پر منفی اثر پڑتا ہے، اسی تاثر کے ساتھ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی سے اس سلسلہ میں استفسار کیا تو مولانا نے کتاب کی مکمل توثیق کی، مولانا اکبرآبادی کا سوال اور مولانا اعظمی کا جواب خود مولانا اکبرآبادی کی زبانی سنیے:

"مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی جو اسی زمانہ کے نامور محقق اور محدث ہیں، میں نے ایک خط کے ذریعہ ان سے اس بارے میں استصواب کیا تو مولانا نے تحریر فرمایا: "پروفیسر سخاو پر یہ شبہ اور بدگمانی بالکل بے جا ہے، میں نے خود طبقات کے مطبوعہ نسخہ کا مقابلہ اس کے اصل مخطوطہ کے ساتھ حرفاً حرفاً کیا ہے اور کہیں میں نے دونوں میں عدم مطابقت نہیں پائی"۔ (۹۰)

طبقات ابن سعد کی تلاش و طباعت کا کارنامہ تو جرمن مستشرقین نے انجام دیا ہے، ضرورت ہے کہ پھر سے طبقات کی تخریج و مراجعت اور اس کے ثقہ و غیر ثقہ رجال اور کمزور و ضعیف راویوں کا دوسرے محدثین سے موازنہ کر کے ایک محقق نسخہ شائع کیا جائے، ابن سعد کے بعد اصحاب الروایۃ اور اصحاب الرجال نے جرح و تعدیل اور اسماء الرجال پر کثرت سے کتابیں لکھی ہیں، اس لیے اب یہ کام کچھ مشکل نہیں ہے۔ وما ذالك على الله بعزيز۔

حواشی

(۱) خیر الدین الزرکلی، الاعلام ج ۶ ص ۱۳۶، ۱۳۷، دار العلم بیروت ۱۹۹۰ء نیز دیکھیے حافظ ابن حجر عسقلانی، تہذیب التہذیب ج ۹، ص ۱۸۲، دائرۃ المعارف النعمانیہ حیدرآباد ۱۳۲۶ھ۔ (۲) ابن العماد حنبلی، شذرات الذہب، ج ۲، ص ۶۹ بیروت۔ (۳) ابن ندیم، الفہرست ص ۱۵۱، المکتبۃ التجاریۃ الکبری مصر۔ (۴) ابوبکر ابن خلکان، وفیات الاعیان ج ۳، ص ۳۷۳، مکتبۃ النہضۃ مصر ۱۹۴۸ء۔ (۵) تہذیب التہذیب ج ۹، ص ۱۸۳۔ (۶) ایضاً۔ (۷) تہذیب التہذیب ج ۹، ص ۱۷۲۔ (۸) وفیات الاعلان ج ۶ ص ۳۷۳۔ (۹) سیرت نبوی کی اولین کتابیں اوران کے مؤلفین ص ۱۷۹، ادارہ ادبیات دلی ۱۹۷۴ء۔ (۱۰) شبلی نعمانی، مقالات شبلی ج ۴، ص ۲، مطبع معارف اعظم گڈھ، ۱۹۵۶ء۔ (۱۱) سعید احمد اکبرآبادی، عثمان ذی النورین ص ۲۴، ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۸۳ء۔ (۱۲) ماہنامہ نقوش، رسول نمبر اول، ص ۱۵۷، لاہور ۱۹۸۲ء۔ (۱۳) ایضاً ص ۵۰۶۔ (۱۴) نثار احمد فارقی، نقوش رسول نمبر اول، ص ۵۰۶۔ (۱۵) احسان عباس، مقدمہ طبقات ابن سعد اول، ص ۱۰، بیروت ۱۹۶۰ء۔ (۱۶) سیرت نبوی کی اولین کتابیں اوران کے مؤلفین، ص ۱۷۰، ۱۷۱۔ (۱۷) الطبقات الکبری دوم، ص ۵، ۶۔ (۱۸) ایضاً۔ (۱۹) ایضاً ص ۲۱۔ (۲۰) ایضاً، چہارم ص ۱۳۵۔ (۲۱) ایضاً، ششم، ص ۱۰۳۔ (۲۲) ایضاً، ج ۶ ص ۱۶۔ (۲۳) ایضاً، ج ۷، ص ۳۲۲۔ (۲۴) ایضاً، ج ۶، ص ۳۳۳۔ (۲۵) ایضاً، ج ۶ ص ۳۷۶۔ (۲۶) ایضاً، ج ۷، ص ۲۴۵۔ (۲۷) الجرح والتعدیل، ج ۹، ص ۱۶۸۔ (۲۸) الطبقات الکبریٰ، ج ۷، ص ۳۲۰۔ (۲۹) ایضاً، ج ۷، ص ۴۶۷۔ (۳۰) ایضاً، ج ۶ ص ۴۰۶۔ (۳۱) الفہرست، ص ۱۵۱۔ (۳۲) ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، کتابیات فراہی، ص ۳۴، علی گڑھ، ۱۹۹۱ء۔ (۳۳) سیرت نبوی کی اولین کتابیں اوران کے مؤلفین، ص ۱۸۰۔ (۳۴) الطبقات الکبریٰ دوم، ص ۵، ۶۔ (۳۵) احسان عباس، مقدمہ الطبقات الکبریٰ اول، ص ۱۶۔ (۳۶) دیکھیے: تہذیب التہذیب، ج ۱۰، ص ۴۲۱، ۴۲۲۔ (۳۷) الطبقات الکبریٰ،

ج ۵،ص ۴۱۸۔ (۳۸) ایضاً، ج ۳،ص ۵۷۷۔ (۳۹) ایضاً،ص ۴۷۹۔ (۴۰) ابن حجر العسقلانی، لسان المیزان، جلد ششم ،ص ۱۹۶، حیدر آباد، ۱۳۳۱ھ نیز دیکھیے : شذرات الذہب ،ج ۲،ص ۱۳، المکتب التجاری ، بیروت ۔ (۴۱) الطبقات الکبریٰ ، ج ۱،ص ۱۰۰۔ (۴۲) ایضاً، ج ۳،ص ۴۵۲۔ (۴۳) ایضاً، ج ۴،ص ۲۸۱۔ (۴۴) شبلی نعمانی، سیرت النبیؐ ، ج ۱،ص ۴۵، مکتبہ مدینہ، لاہور، ۱۴۰۸ھ ۔ (۴۵) ایضاً ،ص ۴۸۔ (۴۶) ابن تیمیہ، الصارم المسلول علی شاتم الرسول ،ص ۹۷، دار الکتب العلمیہ ، بیروت، ۱۹۷۸ء۔ (۴۷) حافظ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج ۳،ص ۲۳۴، ۲۳۵، دار الفکر العربی ۱۹۳۲ء۔ (۴۸) تہذیب التہذیب ، ج ۹،ص ۱۸۲۔ (۴۹) ایضاً۔ (۵۰) الفہرست ،ص ۱۵۱۔ (۵۱) ایضاً ص ۱۸۳۔ (۵۲) شبلی نعمانی، سیرت النبیؐ ، ج ۱،ص ۳۶۔ (۵۳) سیرت النبیؐ ، ج ۱،ص ۳۲۔ نیز دیکھیے : مقالات شبلی ج ۴،ص ۱۔ (۵۴) ظفر احمد صدیقی ،مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار،ص ۶۶، دیوبند، ۲۰۰۱ء۔ (۵۵) سیرت النبیؐ ، ج ۲،ص ۱۴۳۔ (۵۶) الطبقات الکبریٰ اول ،ص ۱۱۳۔ (۵۷) سیرت النبیؐ اول ،ص ۱۱۱۔ (۵۸) الطبقات الکبریٰ اول ،ص ۱۱۶۔ (۵۹) سیرت النبیؐ ، ج ۱،ص ۱۴۷۔ (۶۰) الطبقات الکبریٰ ، ج ۱،ص ۲۰۷۔ (۶۱) سیرۃ النبیؐ اول ،ص ۱۵۱۔ (۶۲) الطبقات الکبریٰ اول ،ص ۲۱۳۔ (۶۳) سیرت النبی اول ،ص ۱۶۴۔ (۶۴) الطبقات الکبریٰ اول ،ص ۲۳۲ ۔ (۶۵) سیرت النبی اول ،ص ۱۶۵۔ (۶۶) الطبقات الکبریٰ سوم ،ص ۶۳۳۔ (۶۷) سیرۃ النبیؐ اول ،ص ۱۸۷۔ (۶۸) الطبقات الکبریٰ ہشتم ،ص ۶۳۔ (۶۹) سیرت النبیؐ اول ،ص ۲۲۳۔ (۷۰) الطبقات الکبریٰ دوم ،ص ۵۰۔ (۷۱) سیرت النبیؐ اول ،ص ۲۳۱۔ (۷۲) الطبقات الکبریٰ دوم ،ص ۵۰۔ (۷۳) سیرت النبیؐ اول ،ص ۲۳۷۔ (۷۴) الطبقات الکبریٰ دوم ،ص ۶۳، ۶۵۔ (۷۵) دیکھیے :مولانا شبلی نعمانی بحیثیت سیرت نگار ،ص ۶۵ تا ۱۰۲۔ (۷۶) الطبقات الکبریٰ ، ج ۸،ص ۹۸، ۹۹۔ (۷۷) الصحیح المسلم ، ج ۲،ص ۳۰۴، مکتبہ رشیدیہ، دہلی ۔ (۷۸) سیرت النبیؐ ، ج ۲،ص ۲۴۶، ۲۴۷۔ (۷۹) ایضاً، ج ۱،ص ۲۳۸۔ (۸۰) ایضاً۔ (۸۱) ایضاً، حاشیہ از سید سلیمان ندوی۔ (۸۲) ایضاً، ج ۱،ص ۴۵۔ (۸۳) اصح السیر ،ص ۳۱، دار الکتاب ، دیوبند۔ (۸۴) ماہنامہ نقوش، شمارہ نمبر ۱۳۰، رسول نمبر ۱،ص ۵۱۲، لاہور، ۱۹۸۲ء۔ (۸۵) سیرت النبیؐ اول ،ص ۴۶ ۔ (۸۶) الطبقات الکبریٰ سوم ،ص ۱۶۵ ۔ (۸۷) اس سلسلہ میں مقالات کا انگریزی ترجمہ علامہ مارما ڈیوک پکتھال نے اسلامک کلچر حیدر آباد میں شائع کیا تھا، جسے پروفیسر حسین انصار نے عربی میں منتقل کیا اور عربی سے اردو میں ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے ترجمہ کیا، دیکھیے : سیرت نبوی کی اولین کتابیں اور ان کے مؤلفین، ادارہ ادبیات دلی، ۱۹۷۴ء۔ (۸۸) اصح السیر ،ص ۳۱۔ (۸۹) ماہنامہ نقوش ، شمارہ ۱۳۰، رسول نمبر اول ،ص ۶۳، لاہور، ۱۹۸۲ء۔ (۹۰) سعید احمد اکبر آبادی، عثمان ذی النورین ،ص ۲۴، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۸۳ء۔

حدیث نعمان بن بشیرؓ اور اس سے مستفاد احکام و مسائل

جناب محفوظ الرحمٰن فیضی

حضرت نعمان بن بشیر بن سعد بن ثعلبہ قبیلہ خزرج سے تعلق رکھنے والے انصاری صحابی ہیں، والد و والدہ عمرہ بنت رواحہ صحابی ہیں، مدینہ میں پیدا ہوئے، ہجرت نبوی کے بعد قبیلۂ انصار میں سب سے پہلے یہی پیدا ہوئے، بعد میں شام میں سکونت اختیار کی۔ کوفہ اور حمص کے گورنر رہے، بڑے فصیح اللسان تھے، باختلاف روایت ۶۴ھ یا ۶۵ھ یا ۶۶ھ میں فوت ہوئے۔ ان کے والد بشیر بن سعد انصاری غزوہ بدر کے علاوہ احد، خندق وغیرہ اور بیعت عقبہ میں بھی شریک تھے۔ روایت ہے کہ قبیلۂ انصار میں سے سب سے پہلے انہوں نے حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ معرکۂ عین التمر میں ۱۳ھ میں شہید ہوئے۔

حضرت نعمان کی والدہ، عمرہ بنت رواحہ مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن رواحہ کی ہمشیرہ اور ان خواتین میں تھیں جنھوں نے رسول اللہؐ سے بیعت کی تھی۔

حضرت نعمان بن بشیرؓ سے ایک حدیث جس میں انہیں ان کے والد کے ایک غلام ہبہ کرنے کا واقعہ اور ارشاد نبوی ''اعدلوا بین اولادکم'' وارد ہے۔ اکثر کتب حدیث صحیح بخاری، صحیح مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، موطا امام مالک، مسند احمد، صحیح ابن حبان، طحاوی، بیہقی وغیرہ میں مختلف طرق سے مختصراً و مفصلاً مروی ہے۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ سے اس حدیث کو متعدد تابعین مثلاً عامر شعبی (صحیحین ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، احمد، ابن حبان وغیرہ) عروہ بن الزبیر (مسلم،

مئوناتھ بھنجن۔

نسائی، ابوداؤد) ابوالضحی (احمد، نسائی، ابن حبان، طحاوی) مفضل بن مہلب (احمد، ابوداؤد، نسائی) عبید اللہ بن عتبہ بن مسعود (احمد) عون بن عبداللہ (ابوعوانہ) وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح امام عامر شعبی سے ان کے بکثرت اصحاب نے اسے روایت کیا ہے۔ (فتح الباری، ج ۲، ص ۲۱۲)۔

حدیث نعمان بن بشیرؓ: عن عامر الشعبی قال سمعت النعمان بن بشیرؓ وهو على المنبر يقول سالت امی بعض الموهبة لی من ماله ، (فالتوی سنة) ثم بداله ، فوهبهالی / فاعطانی عطية ، فقالت عمرة بنت رواحة لا ارضى حتى تشهد رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ، فاخذ (ابی) بیدی وانا (یومئذ) غلام ، قال (فانطلق ابی یحملنی) فاتی رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم فقال ان امه بنت رواحة سالتنی بعض الموهبة لهذا ، فقال انی نحلت / اعطیت ابنی عن عمرة بنت رواحة عطيةً / غلاماً ،فامرتنی ان اشهدك يا رسول الله ، قال الك ولد سواه ؟ (الك بنون سواه/ اله اخوة سواه؟) قال نعم ، قال اعطیت سائر ولدك مثل هذا ؟ (اكل بينك نحلت مثل مانحلت النعمان ؟) قال لا ، قال صلی اللہ علیہ وسلم لا اشهد على جور/ لا تشهدنی على جور (فاشهد على هذا غیری ، قال ايسرك ان يكونوا اليك فى البر سواء ؟ قال بلى ، قال فلا اذاً) قال صلی اللہ علیہ وسلم : فارجعه واتقوا الله واعدلوا بين اولادكم ، (فى النحل) قال فرجع (ابی) فرد عطيته (صحيح البخاری : كتاب الهبة باب الهبة للولد وباب الاشهاد فى الهبة ، وكتاب الشهادات باب لا يشهد على شهادة جور اذا اشهد ۔ (فتح الباری ،ج ۲ ، ص ۲۱۱ و ۲۵۸ ، حديث رقم ۲۵۸٦ و ۲۵۸۷ و ۲٦۵۰) ، صحيح مسلم : كتاب الهبات / باب كراهية تفضيل بعض الاولاد فى الهبة، ۱۱/ ٦۸ — ۷۱ / ٤۱۵۳ — ٤۱٦۱) مابین القوسین الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔

حضرت عامر شعبی بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت نعمان بن بشیرؓ سے منبر پر یہ کہتے ہوئے سنا کہ میری ماں نے میرے والد سے کہا آپ اپنے مال میں سے نعمان کو کچھ ہبہ کردیں، والد صاحب نے پہلے تو اسے برس دن ٹالا، پھر راضی ہوگئے اور مجھے ایک عطیہ دیا، لیکن میری

والدہ نے کہا میں اس وقت مانوں گی کہ جب آپ اس پر رسول اللہ کو گواہ بنائیں۔ چنانچہ والد صاحب میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے لیے ہوئے نبی اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں اس وقت ابھی بچہ تھا، والد صاحب نے نبیؐ سے عرض کیا، اس لڑکے کی ماں عمرہ بنت رواحہ نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں اس لڑکے کو کچھ ہبہ کردوں، چنانچہ میں نے اسے ایک غلام ہبہ کردیا(۱) تو اس کی والدہ نے کہا اس ہبہ پر میں آپ کو یا رسول اللہ کو گواہ بنالوں، آنحضورؐ نے میرے والد سے دریافت کیا، اس کے علاوہ بھی تمہاری کوئی اولاد ہے؟ (مسلم وغیرہ کی روایت میں ہے کہ آنحضرتؐ نے پوچھا: ''کیا اس لڑکے کے علاوہ بھی تمہارے بیٹے ہیں'' ایک دوسری روایت میں ہے: کیا اس کے اور بھی بھائی ہیں؟ والد نے کہا ہاں ہیں تو آنحضرتؐ نے دریافت کیا: کیا تم نے اپنی سب اولاد کو اتنا اتنا دیا ہے؟ (مسلم کی روایت میں ہے: کیا سب بیٹوں کو وہ دیا ہے جو نعمان کو دیا ہے؟) میرے والد نے کہا نہیں سب کو نہیں دیا ہے تو نبیؐ نے فرمایا:

''مجھے ظلم و جور پر گواہ نہ بناؤ، میں ظلم و جور پر گواہی نہیں کرتا (اور بطور زجر و توبیخ فرمایا) جاؤ میرے علاوہ کسی اور کو گواہ بنالو۔ کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ تمہاری تمام اولادیں تمہارے ساتھ یکساں حسن سلوک اور نیک برتاؤ کریں؟ حضرت بشیرؓ نے کہا کیوں نہیں؟ تو آنحضرتؐ نے فرمایا: پھر تم بھی ایسا نہ کرو (کہ اپنی اولاد کے درمیان ہبہ وعطیہ میں تفریق کرو، تمہارے بیٹوں کا تمہارے اوپر حق ہے کہ ان کے درمیان عدل کرو، جیسا کہ ان پر تمہارا یہ حق ہے کہ وہ سب تمہارے ساتھ نیک سلوک کریں''۔ مسند احمد، ابوداؤد) رسول اللہؐ نے حکم دیا کہ نعمان کو جو دیا ہے اسے واپس لے لو، اللہ سے ڈرو، عطیہ دینے میں اولاد کے درمیان عدل کرو۔ ''اتقوا اللہ واعدلوا بین اولادکم''۔

حدیث شریف سے ثابت شدہ احکام ومسائل: حدیث نعمان بن بشیرؓ سے درج ذیل متعدد احکام ومسائل مستفاد اور ثابت ہوتے ہیں:

پہلا مسئلہ۔ ہبہ علی الاولاد جائز ہے: اس حدیث سے ہبہ علی الاولاد کا جائز ہونا ثابت ہوتا ہے، یعنی کوئی شخص اپنی اولاد کو (نفقات واجبہ کی ادائیگی کے علاوہ بھی) کسی ضرورت و مصلحت کے پیش نظر از راہ خیر خواہی اپنے اموال و جائداد (منقولہ یا غیر منقولہ) سے ہبہ کرے تو

یہ جائز درست اور صحیح ہے کیوں کہ رسول اللہؐ نے مذکورہ واقعہ میں نفس ہبہ علی الاولاد پر کوئی نکیر نہیں فرمائی ہے، بلکہ نکیر اس پر ہے کہ حضرت بشیرؓ نے تمام اولادوں میں صرف ایک کو ہبہ کرنا چاہا تھا جو عدل کے خلاف تھا۔ اسی لیے آپؐ نے گواہی بھی نہیں دی۔ عدل کے ساتھ ہبہ علی الاولاد کے جواز و مشروعیت میں کوئی اختلاف نہیں۔

دوسرا مسئلہ- ہبہ علی الاولاد میں عدل ضروری ہے: حدیث نعمان بن بشیرؓ سے دوسری اہم بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ اولاد کے درمیان عدل وانصاف کرنا شرعاً ضروری اور مطلوب ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ البتہ اختلاف اس میں ہے کہ یہ عدل کس درجہ میں مطلوب ہے۔ واجب وفرض ہے یا مندوب ومستحب۔

ہبہ بین الاولاد میں عدل واجب ہے: اہل علم کی ایک جماعت نے ہبہ میں عدل بین الاولاد کو واجب قرار دیا ہے اور یہی صحیح ہے، کیونکہ رسول اللہؐ نے عدل کا حکم فرمایا ہے، یہ صیغہ امر ہے اور امر وجوب پر دلالت کرتا ہے، نیز عدل نہ کرنے کو آنحضرتؐ نے ''ناحق اور ظلم وجور'' قرار دیا ہے، ظلم و جور بلاشبہ حرام ہے، اس لیے اس سے بچنا اور عدل کرنا واجب ہے، اولاد کے درمیان عدل کرنے ہی میں عائلی نظام کی استواری، باپ بیٹوں، بھائیوں اور بہنوں کے درمیان باہم الفت ومحبت کی بقاء اور نشو ونما مضمر ہے کسی کو دینے یا کسی کو محروم کرنے کی صورت میں باہم رنجش، اختلاف ونزاع، قطع رحم اور عقوق کے جذبات رونما ہونے کا قوی اندیشہ ہوتا ہے۔ قطع رحم اور عقوق حرام ہیں اور جو طریقہ حرام کا موجب ہو وہ بھی حرام ہوگا، پس ہبہ وعطیہ میں اولاد کے درمیان عدل نہ کرنا حرام اور عدل کرنا واجب ہے۔

امام ابن حزمؒ کے بیان کے مطابق حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت عائشہؓ صدیقہ، حضرت قیس بن سعد بن عبادہؓ سے یہی منقول ہے۔ اسی طرح امام مجاہد، امام طاؤس، امام عطاء بن ابی رباح، امام عروہ بن الزبیر، امام ابن جریج، امام عامر شعبی، قاضی شریح، ابراہیم نخعی، امام بن شبرمہ، امام سفیان ثوری، امام احمد بن حنبل، امام اسحاق بن راہویہ وغیرہ تابعین وائمہ فقہ وحدیث کا بھی یہی مذہب ہے۔ امام بخاری نے بھی جامع صحیح میں اس کی تصریح فرمائی ہے، امام داؤد ظاہری کا بھی یہی مذہب ہے، امام خطابی امام ابن حزم وغیرہ کے

نزدیک بھی یہی محقق ہے۔ (ملاحظہ ہو محلی بن حزم، ج ۱۰ر مسئلہ ۱۶۳۴، فتح الباری، ج ۵ر ص ۲۱۴)

علمائے اہل حدیث بھی ہبہ میں وجوب عدل بین الاولاد ہی کے قائل ہیں، البتہ ان کے نزدیک اولاد کی باہمی رضامندی و مفاہمت سے تفضیل و تخصیص جائز ہے لیکن اگر محض تفضیل و تخصیص کو روبہ کار لاکر کسی کو کم یا زیادہ یا کسی کو محروم کر دیا گیا ہو تو چونکہ اس ہبہ علی الاولاد میں عدل کا لحاظ نہیں کیا گیا اس لیے یہ ہبہ باطل ہے۔ جیسا کہ نعمان بن بشیرؓ کے واقعہ سے ثابت ہے کہ رسول اللہؐ نے اس ہبہ کو رد فرمادیا اور شئی موہوب کو واپس لینے کا حکم دیا۔

اگر کسی نے اپنی اولاد میں سے بعض کو دیا بعض کو نہیں دیا، یا کم و بیش دیا اور موہوب لہم نے شئی موہوب پر قبضہ بھی کرلیا اور والد نے حین حیات اسے واپس بھی نہیں لیا اور نہ ہی اس میں اصلاح کی تو یہ ہبہ چونکہ باطل اور رد ہے، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، اس لیے شئی موہوب قبضہ و دخل کے باوجود موہوب لہم کی ملک نہ ہوگی بلکہ وہ سب والد کا ترکہ قرار پائے گی اور جملہ ترکہ میں شامل ہوگی اور تمام ورثاء میں حسب قاعدہ میراث تقسیم ہوگی۔

اگر کسی والد نے اپنی موجود اولاد کو عدل کے ساتھ کچھ ہبہ کیا یا عطیہ دیا، اس کے بعد ایک اور بچہ کی پیدائش ہوئی تو والد پر لازم ہے کہ اپنے دوسرے بیٹوں کی طرح اس نومولود کو بھی عدل کے ساتھ وہی دے جو اس نے ان کو ہبہ کیا ہے۔ اگر کسی سبب سے اس کو موقع نہیں ملا یا بچہ کی پیدائش سے قبل اس کا انتقال ہوگیا، ان تمام صورتوں میں عدل واجب کا تقاضا یہ ہے کہ وہ نومولود بھی اس ہبہ کا حق دار ہوگا جس کی دو صورت ہے:

ایک تو یہ کہ نومولود بھی دیگر اولاد کے ساتھ سابقہ ہبہ میں عدل کے ساتھ شریک قرار دیا جائے گا اور اس کو بھی اس میں سے بقدر حصہ دیا جائے گا۔ دوسری صورت یہ ہوگی کہ والد کے ترکہ میں سے پہلے اس نومولود کو اتنا دے دیا جائے گا جتنا سابقہ ہبہ میں ہر ایک کو والد نے دیا ہے، اس کے بعد ترکہ کی تقسیم عمل میں لائی جائے گی۔

حضرت سعد بن عبادہؓ نے اپنا سب مال اپنے موجود بیٹوں میں تقسیم کردیا تھا، ایک بچہ ان کی وفات کے بعد پیدا ہوا، حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس گئے اور کہا میں اس نومولود کی وجہ سے رات بھر سویا نہیں، اس بچہ کا کیا ہوگا؟ اس کے لیے تو کچھ بچا نہیں

ہے۔ کیونکہ اس کے والد حضرت سعد بن عبادہؓ نے تو اس کی پیدائش سے پہلے ہی اپنا سب کچھ اپنی موجود اولادوں میں تقسیم کر دیا تھا، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا کہ میرا بھی یہی حال ہے میں بھی رات بھر فکر مند رہا۔ چلو سعد بن عبادہؓ کے بیٹے قیس کے پاس چلتے ہیں اور ان سے اس نومولود بھائی کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں (ابوبکر و عمر) قیس بن سعد کے پاس گئے، ان سے گفتگو کی، حضرت قیس نے کہا میں والد کے عمل کو رد تو نہیں کر سکتا لیکن آپ دونوں گواہ رہیں، میں نے اپنا حصہ اپنے اس بھائی کو دے دیا۔

امام ابن حزم کہتے ہیں اس طرح حضرت قیس نے اپنے نومولود بھائی کو اس کے حصہ سے زیادہ ہی دے دیا، اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے بھی اس کو برقرار رکھا جو اس کے صحت اعتدال کی دلیل ہے۔ (محلی، ج ۱۰/ مسئلہ ۱۶۳۴)

جمہور کے نزدیک ہبہ میں عدل بین الاولاد واجب نہیں مستحب ہے: حافظ ابن حجر اور امام ابن رشد وغیرہ کی تحقیق کے مطابق جمہور فقہاء مثلاً امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام ربیعہ وغیرہ کے نزدیک ہبہ علی الاولاد میں سب کو برابر برابر دینا واجب نہیں، مستحب ہے۔ اور کسی کو کم یا زیادہ یا کسی کو محروم کر دینا مکروہ ہے، یعنی افضل و اولیٰ تو عدل و تسویہ ہی ہے لیکن کسی ضرورت و مصلحت کی بنا پر کوئی شخص اپنی اولاد میں سے کسی کو زیادہ کسی کو کم یا کسی کو دے یا نہ دے، تو یہ ہبہ بھی قبول و قبضہ وغیرہ کی شرائط کے ساتھ صحیح اور نافذ ہے۔

حالانکہ نعمان بن بشیر سے مروی حدیث وجوب عدل پر دلالت کرنے میں ظاہر بلکہ تقریباً صریح اور نص ہے، منکرین وجوب نے حدیث نعمان بن بشیر کے جو جوابات دیے اور تاویلیں کی ہیں، وہ سب مخدوش اور کمزور دلائل پر مبنی ہیں (۲)۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: محلی ابن حزم، ج ۱۰/ مسئلہ ۱۶۳۴، فتح الباری، ج ۵، ص ۲۱۴-۲۱۵، فقہ السنہ، ج ۳، ص ۳۹۳-۳۹۴۔

امام احمد بن حنبل اور بعض سعودی علماء ہبہ و عطیہ میں وجوب عدل بین الاولاد کے قائل ہونے کے باوجود اس امر کو جائز قرار دیتے ہیں کہ کوئی اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو واقعی ضرورت و حاجت کی بنا پر از راہ خیر خواہی زیادہ ہبہ کرنا چاہیے تو کر سکتا ہے، مثلاً وہ مشتغل بالعلم ہو، یا کثیر العیال ہو یا کسی مزمن بیماری میں مبتلا ہو، یا قرض دار ہو، یا مجبور ہو یا تنگ دست ہو وغیرہ۔ ایسی صورت میں

امام ابوحنیفہ وغیرہ کے نزدیک بھی تفضیل مکروہ نہیں ہے، زیادہ دینا بلا کراہت جائز ہے مگر ان سب کے نزدیک یہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ دوسری اولاد کو ضرر پہنچانا مقصود نہ ہو، اسی طرح ان کے نزدیک یہ بھی جائز ہے کہ کوئی اپنی فاسق وفاجر اولاد کو جس کے بارے میں یہ قوی اندیشہ ہو کہ وہ مال موہوب کو ضائع و برباد کردے گا، کم دے یا نہ دے، کیونکہ اسے دینا گویا فسق و معصیت پر اس کی مدد کرنا ہے۔ (المغنی، ج ۵، ص ۶۶۵، فتاوی ہندیہ، ج ۴، ص ۳۹۱، مجموعہ قوانین اسلامی، ص ۲۶۱، شائع کردہ مسلم پرسنل لا بورڈ)

امام ابن قدامہ فرماتے ہیں کہ یہ تجویز وتوجیہ ظاہر حدیث کے خلاف ہے، رسول اللہؐ نے حضرت بشیرؓ سے تفضیل کا کوئی سبب پوچھے بغیر نفس تفضیل و تخصیص کی بنا پر ان کے ہبہ کو رد فرمادیا تھا۔ (المغنی، ج ۵) علامہ نواب صدیق حسن خان فرماتے ہیں کہ کسی سبب اور حاجت کی بنا پر بھی تفضیل و تخصیص یعنی کم وبیش دینا یا کسی کو دینا یا کسی کو نہ دینا جائز نہیں ہے، جواز کی کوئی شرعی دلیل نہیں ہے۔ (الروضۃ الندیہ، ج ۲، ص ۵۲۸)

ہبہ میں عدل بین الاولاد کا معنی: زیر بحث موضوع سے متعلق ایک اہم بات یہ ہے کہ ہبہ میں عدل بین الاولاد کا معنی اور اس کی صورت کیا ہے، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی وغیرہ کے نزدیک ہبہ میں اولاد کے درمیان عدل کرنے کے معنی بیٹے اور بیٹیوں کو برابر برابر دینا ہے، نہ کہ دستور وراثت (للذکر مثل حظ الانثیین) کے مطابق بیٹا کو دوگنا اور بیٹی کو اکہرا دینا ہے۔ ان کے نزدیک عدل کا ظاہر معنی یہی ہے اور لفظ اولاد بھی عام ہے جس میں اولاد ذکور و اناث سب شامل ہیں۔ حدیث نعمان بن بشیرؓ کی بعض روایات میں تسویہ کی صراحت ہے، سوِّ بینہم ۔ لا سوّیت بینھم (نسائی)۔ اسی طرح حضرت ابن عباسؓ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

سووا بین اولادکم فی العطیۃ، فلو کنت مفضلا احدا لفضلت النساء۔	یعنی عطیہ میں اپنی اولاد کو برابر دو، اگر میں کسی کو فضیلت دیتا تو عورتوں کو دیتا۔ (۳)

(طبرانی، بیہقی، الضعیفہ، ج ۱، حدیث ۳۴۰)

اسی طرح حدیث نعمان بن بشیر کی متعدد روایات میں یہ الفاظ ہیں کہ رسول اللہؐ نے

بشیر سے پوچھا کیا اس کے علاوہ تمہاری اور بھی اولادیں ہیں؟ کیا ہر ایک کو اسی کے مثل دیا ہے؟ (الک ولد غیر ہذا؟ اکل ولدک نحلت مثل ہذا) لفظ ولد عام ہے جس میں دونوں شامل ہیں۔

اکثر علمائے اہل حدیث کا فتویٰ بھی اسی پر ہے ۔امام عطاء، قاضی شریح، امام محمد، امام احمد بن حنبل، امام اسحاق بن راہویہ اور بعض فقہائے مالکیہ وشافعیہ وغیرہ کے نزدیک ہبہ وعطیہ میں عدل بین الاولاد کا معنی یہ ہے کہ وراثت کے قانون (للذ کر مثل حظ الانثیین) کے مطابق بیٹے کو بیٹی کا دوگنا دیا جائے، کیونکہ ترکہ اور ہبہ دونوں والد ہی سے ملنے والا عطیہ اور حصہ ہے، بس فرق یہ ہے کہ ہبہ والد کی زندگی میں ملتا ہے اور ترکہ وفات کے بعد، لہذا عدل یہی ہے کہ اولاد ذکور واناث کو ہبہ برابر دیا جائے۔(۴) جو علت اور مصلحت ترکہ میں ملحوظ ہے وہی یہاں بھی موجود ہے۔

امام عطاء اس سلسلہ میں صحابہ وتابعین کے تعامل کو بیان کرتے ہیں کہ "ماکانوا یقتسمون الاعلی کتاب الله "۔لوگ یعنی صحابہ وتابعین (ہبہ وعطیہ) کتاب اللہ میں مذکور قانون میراث کے مطابق تقسیم کرتے تھے۔(المغنی، ج ۵،ص ۶۶۶) شیخ الاسلام ابن تیمیہ، امام ابن القیم، اسی طرح علامہ نواب صدیق حسن خان، علامہ محمد ناصر الدین البانی اور متعدد علمائے سعودیہ علامہ ابن باز وغیرہ اور سعودیہ کی "لجنۃ دائمۃ للبحوث العلمیہ والافتاء" کے نزدیک حق و صواب اور عدل یہی ہے کہ ہبہ وعطیہ میں بیٹا کو بیٹی کے دوگنا دیا جائے اور للذ کر مثل حظ الانثیین پر عمل کیا جائے۔(مجموع فتاوی ابن تیمیہ (۱۹۷/۳۱)، مجموع فتاوی شیخ ابن باز (۲۰/۴۷-۴۹)، فتاوی لجنۃ دائمہ (۲۱۳/۱۶)، توضیح الاحکام شرح بلوغ المرام للشیخ عبداللہ البسام (ج ۲۶۵/۴)، الروضۃ الندیہ (ج ۵۲۸/۲)۔

اس اہم بحث کا تمام تر مدار نعمان بن بشیر سے متعدد طرق سے مروی حدیث پر ہے، زیر بحث مسئلہ میں دو باتیں قابل توجہ ہیں: ایک تو یہ کہ اکثر طرق میں امر نبوی بلفظ "اعدلوا" وارد ہے "سووا" نہیں ہے، چنانچہ یہ لفظ "سووا" نہ صحیحین میں ہے نہ ابوداؤد میں صرف نسائی کی ایک روایت میں ہے اور ترمذی وابن ماجہ میں نہ لفظ "اعدلوا" ہے نہ "سووا"، اسی طرح موطا، مسند احمد، صحیح ابن حبان وغیرہ میں بھی یہ حدیث بلفظ "اعدلوا" ہی وارد ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لفظ "سووا" روایت بالمعنی ہے اور اصل لفظ نبوی "اعدلوا" ہے، اس سے ثابت ہوا کہ رسول اللہؐ نے

''عدل'' کا حکم دیا ہے نہ کہ ''تسویہ'' کا اور عدل تسویہ کو مستلزم نہیں ہے، چنانچہ ترکہ میں بیٹے کو بیٹی کے بالمقابل دوگنا ہے، دونوں کا حصہ برابر نہیں ہے اور یہ عین عدل اور کتاب اللہ کے مطابق ہے لہذا اسی پر عمل بہتر ہے۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ حدیث نعمان بن بشیر میں جیسے یہ الفاظ وارد ہیں کہ "هل لك ولد غيره" "هل لك ولد سواه" "اعطيت سائر ولدك مثل هذا" "اكل ولدك نحلت مثل هذا" اسی طرح یہ الفاظ بھی وارد ہیں: "اكل بينك نحلت مثل هذا" (مسلم، ابوداؤد، نسائی)، "اله بنون سواه" (مسلم، ابوداؤد، نسائی)، "اله اخوة" (مسلم، ابوداؤد)، "اعطيت لاخوته مثل هذا" (نسائی، ابوداؤد)۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اول الذکر روایات میں لفظ ''ولد'' سے بیٹا، بیٹی کو شامل عام معنی مراد نہیں ہے بلکہ ولد ذکر (بیٹا) مراد ہے، گویا حضرت بشیر کے اور بیٹے تو تھے اور رسول اللہؐ نے ان سب بیٹوں کو نعمان کے مثل دینے کے لیے کہا تھا، اس میں بیٹی کو بھی بیٹے کے مثل دینے کا حکم نہیں دیا گیا ہے، اس واقعہ میں بیٹی، بہن کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے، گویا حضرت بشیر کی اس وقت کوئی بیٹی نہیں تھی۔ ہبہ میں بیٹا، بیٹی کو بالکل برابر دینے کے حکم کے بارے میں کوئی صحیح حدیث نظر سے نہیں گذری، اس لیے ہبۃ علی الاولاد کی صورت میں قانون میراث میں مذکور عدل للذکر مثل حظ الانثیین کے مطابق عمل کرنا زیادہ بہتر ہے، البتہ فتوی میں دونوں طریقے ملحوظ رکھے جائیں۔

جہاں تک زیر کفالت اولاد کے نفقاتِ واجبہ خوراک، لباس پوشاک، تعلیم، دوا وعلاج وغیرہ کا تعلق ہے تو ان سب کے بارے میں اولاد کے درمیان تسویہ کا حکم بہر حال نہیں ہے، بلکہ یہ سب ان کو ان کی حاجت وضرورت کے مطابق دیئے جائیں گے، یہی عدل ہے، امام ابن حزم تحریر فرماتے ہیں:

> ''انما هذا (يعنى التسوية بين الاولاد) في التطوع، اما في النفقات الواجبات، فلا وكذالك الكسوة، ولكن ينفق على كل امرأ منهم بحسب حاجته''۔ (محلی، ج ۱۰/ مسئلہ ۱۶۳۴)

امام ابن تیمیہ تحریر فرماتے ہیں:

"الحديث والآثار تدل على وجوب العدل (بين الاولاد) ثم هنا نوعان، نوع يحتاجون اليه من النفقه في الصحة والمرض ونحو ذلك، فالعدل فيه ان يعطى كل واحد ما يحتاج اليه، ولا فرق بين محتاج قليل او كثير "(الاختیارات العلمیہ/توضیح الاحکام شرح بلوغ المرام للشیخ عبداللہ البسام، ج ۳، ص ۲۶۴)

تیسرا مسئلہ۔ ہبہ میں اولاد کے ساتھ دیگر ورثاء کا حکم: حدیث نعمان بن بشیر سے تیسرا اہم مسئلہ یہ مستنبط ہوتا ہے کہ اگر اولاد کے علاوہ دیگر ورثاء بھی موجود ہیں اور وہ صرف اپنی اولاد کو ہبہ کرے اور دیگر ورثاء کو اس میں شریک نہ کرے تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، اولاد کے ساتھ دیگر ورثاء کو بھی ہبہ کرنے کی صراحت حدیث میں نہیں ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے اس بات پر تو نکیر فرمائی کہ حضرت بشیر نے اپنے ایک بیٹے نعمان کو دیا دوسرے کو نہیں دیا لیکن اس پر کوئی نکیر یا کوئی استفسار نہیں فرمایا کہ انہوں نے اپنی بیوی کو کچھ ہبہ نہیں کیا، حالانکہ بیوی بھی وارث ہے، اگر اس میں کوئی قباحت یا وضاحت طلب بات ہوتی تو آپؐ ضرور اس کی صراحت فرما دیتے۔

چوتھا مسئلہ۔ اولاد کے علاوہ ورثاء و اقارب کو ہبہ کرنے میں عدل کا حکم نہیں: اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر کوئی شخص اپنی اولاد کے علاوہ ورثاء و اقارب کو کچھ ہبہ کرے تو وہ ان کے درمیان عدل و تسویہ کا مکلف نہیں ہے بلکہ برابر برابر دینا، نہ دینا، اس کی مرضی پر موقوف ہے، اس لیے کہ رسول اللہؐ نے "اعدلوا بين اولادكم" فرمایا ہے نہ کہ "اعدلوا بين ورثتكم" اور اصل یہ ہے کہ شریعت کے دائرے میں ہر شخص اپنے مال میں اپنی مرضی اپنی صواب دید کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ (المغنی، ج ۵، توضیح الاحکام، ج ۳، ص ۲۵۶)

بعض علماء نے حدیث نعمان بن بشیر کو موہوبہ شئی کی واپسی کے لیے بہ طور دلیل پیش کیا ہے اور اس سے مستفاد مسائل میں اسے بھی شمار کیا ہے لیکن یہ درست نہیں ہے اس لیے کہ نعمان بن بشیر کے واقعہ میں ہبہ سرے سے درست اور متحقق ہی نہیں ہوا تھا، اس لیے ہبہ کی واپسی کا کیا سوال اس واقعہ میں واپسی عدم اعتبار اور عدم امضاء کے معنی میں ہے، یعنی یہ ہبہ معتبر اور نافذ ہی

نہیں اور والد کو اولاد کو دیئے ہوئے ہبہ کو واپس لینے کے اختیار اور جواز کا مسئلہ مذکورہ، معتبر اور نافذ شدہ ہبہ سے تعلق رکھتا ہے یعنی والد کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے معتبر اور نافذ شدہ ہبہ کو بھی جو اس نے اولاد کو دیا ہے، اولاد سے واپس لے سکتا ہے مگر ہبہ واپس لینے کی کچھ شرائط ہیں جو کتب فقہ میں مرقوم ہیں، مثال کے طور پر موہوب لہ زندہ ہو اور شئی موہوب بھی موجود و برقرار ہو، اگر موہوب لہ مرگیا ہو یا شئی موہوب موجود نہیں رہی، ضائع یا استعمال ہوگئی، تو اب والد کے ہبہ واپسی کا حق ختم ہوگیا یا مثلاً موہوب لہ کے یہاں شئی موہوب کی نوعیت میں تبدیلی ہوگئی ہو یا ایسا اضافہ ہو چکا ہو جسے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا، مثلاً موہوب لہ نے زمین موہوب پر مکان تعمیر کرلیا یا ثوب موہوب کو سی لیا یا مثلاً موہوب جانور موہوب لہ کے یہاں کھاپی کر موٹا تازہ ہوگیا تو ان صورتوں میں واہب والد کو بھی موہوبہ شئی کو واپس لینے کا حق نہیں ہے۔

پانچواں مسئلہ- ہبہ میں قبضہ کا حکم: جمہور ائمہ صحت ہبہ کے لیے شئی موہوب پر موہوب لہ کے قبضہ و دخل کو شرط قرار دیتے ہیں (حالانکہ یہ کسی پختہ دلیل سے ثابت نہیں ہے، دیکھیے محلی ابن حزم، ج ۱۰، مسئلہ ۱۶۳۰) (۵) ان کے نزدیک اس صورت میں کہ موہوب لہ نابالغ ہو (جس کے قبول و قبضہ کا اعتبار نہیں) تو اس کے سرپرست اور ولی کا قبضہ کافی ہے، ان ائمہ کے نزدیک یہ مسئلہ حدیث نعمان بن بشیر سے ثابت ہے، حضرت نعمان نابالغ تھے، ان کے والد نے ان کو غلام ہبہ کیا اور اس پر نعمان کے قبضہ کے بجائے ان کے والد کے قبضہ کو کافی سمجھا گیا۔

اس کے علاوہ متعدد بنیادی اور اصولی باتیں اس حدیث سے معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً شریعت کے خلاف کیا ہوا کوئی عقد، کوئی معاملہ مردود ہے، جیسا کہ اس واقعہ میں خلاف شریعت ہبہ کو مردود قرار دیا گیا یا ہبہ وعطیہ پر گواہ بنالینا مشروع ہے، اگرچہ یہ شرائط و واجبات ہبہ میں نہیں ہے یا ایسے کسی معاملہ پر گواہ نہیں بننا چاہیے جو شرعاً جائز نہیں ہے۔ قاضی یا حاکم یا عالم و مفتی کے سامنے جب کوئی ایسا معاملہ آئے جو شریعت کے خلاف ہو تو اسے فوراً اس کی تردید کرنی چاہیے، یہ بھی معلوم ہوا کہ امیر المومنین اور حاکم وقاضی بھی کسی معاملہ میں گواہ بن سکتا ہے۔

یہ ثابت ہوا کہ جب کسی سے کسی معاملہ پر گواہ بننے کے لیے کہا جائے تو اسے پہلے اس معاملہ کی حقیقت معلوم کرنی چاہیے کہ وہ کیا ہے، جائز بھی ہے یا نہیں، تب گواہ بننا یا نہیں بننا

چاہیے، نامعلوم، ظلم وجور اور ناجائز معاملہ پر گواہ نہیں بننا چاہیے۔

افتاء وارشاد کا یہ اصول مستفاد ہوا کہ اگر سائل ومستفتی کے سوال میں پیش کردہ صورت مسئولہ میں اجمال ہو تو مفتی کو چاہیے کہ پہلے اس کی تفصیل وتوضیح طلب کرلے تب جواب دے۔

تقسیم ترکہ قبل از وفات: ترکہ تو دراصل میت کے اموال متروکہ کو کہتے ہیں، یعنی کسی شخص کے اموال واملاک اس کی حین حیات ترکہ نہیں ہوتے بلکہ اس کی وفات کے بعد ترکہ قرار پاتے ہیں جو (اس کی وفات کے بعد) درحقیقت اس کے ورثاء کی ملک ہوجاتا ہے اور ورثاء میں اس کی تقسیم کا عادلانہ نظام خود اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں بیان فرمادیا ہے، اسی کے مطابق ترکہ کی تقسیم ہوگی۔

اور کسی شخص کی زندگی میں اس کے اموال واملاک (منقولہ وغیر منقولہ) اسی کی ملک ہوتے ہیں اور اسے یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنے ان اموال واملاک کے اندر شریعت کے حدود میں اپنی مرضی اور صواب دید کے مطابق تصرف کرے، نفقات واجبہ میں خرچ کرے، صدقہ وخیرات کرے، وقف وہبہ کرے، اس لیے کسی شخص کا اپنی زندگی میں اپنے اموال وجائداد کو اپنی اولاد یا ورثاء میں تقسیم کرنا تقسیم ترکہ نہیں ہے بلکہ یہ ہبہ ہے اور اولاد یا ورثاء کو ہبہ کرنا جائز ہے۔ حدیث نعمان بن بشیرؓ کی جو توضیح وتشریح اور اس سے مستفاد مسائل کی جو تفصیل گذشتہ صفحات میں بیان کی گئی ہے، زیر عنوان مسئلہ کا حکم معلوم کرنے کے لیے ان تفصیلات پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔

بہت سے لوگ مختلف اسباب ومصالح کے پیش نظر اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ اپنے کل یا بعض اموال وجائداد کو اپنی زندگی ہی میں ورثاء کے درمیان تقسیم کردیں، مختلف لوگوں کے لیے اسباب ومصالح مختلف ہوتے ہیں، مثلاً اولاد وورثاء کے درمیان ترکہ کی تقسیم میں جو اختلاف ونزاع کا اندیشہ ہے اس کی پیش بندی یا ان کے لیے آزادانہ تجارت کرنے، کاروبار بڑھانے یا مکان تعمیر کرنے وغیرہ کے لیے سرمایہ، زمین اور مواقع کی فراہمی یا ان کے قرض کی ادائیگی یا مثلاً یتیم پوتے یا ربیب وربیبہ کی اشک شوئی یا غیر اسلامی حکومت میں ترکہ کی غیر شرعی تقسیم سے بچنے کی تدبیر وغیرہ۔

چنانچہ اس موضوع سے متعلق تحریری وزبانی استفتاء سامنے آتے رہتے ہیں جن میں اس

بارے میں مختلف قسم کے سوالات ہوتے ہیں، مثلاً:

۱- زید اپنی زندگی میں اپنی زمین جائداد اپنے ورثاء میں تقسیم کرنا چاہتا ہے، کیا یہ جائز ہے؟ تقسیم کی صورت کیا ہوگی؟ ۲- کیا اپنی اولاد میں بیٹا، بیٹی کو برابر دے؟ یا حصہ میراث کے مطابق بیٹا کو بیٹی کے دوگنا دے؟ ۳- بیوی کو بھی دینا چاہتا ہے تو کتنا دے؟ ۴- اپنے لیے بھی کچھ محفوظ رکھنا چاہتا ہے تو کتنا رکھنا چاہیے؟ وغیرہ وغیرہ، سابقہ صفحات میں پیش شدہ تفصیلات سے ان سوالات کے جواب مل سکتے ہیں، خلاصہ جواب درج ذیل ہے:

۱- جائز ہے، ناجائز اور ممنوع ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے، ہر بالغ عاقل اپنی ملکیت میں شریعت کے حدود میں اپنی مرضی اور صواب دید کے مطابق تصرف کرنے کے لیے خود مختار ہے، سابقہ صفحات (مسئلہ دوم) میں گذر چکا ہے کہ سعد بن عبادہؓ نے اپنا کل سرمایہ اپنے ورثاء یا اپنی اولاد میں اپنی زندگی ہی میں تقسیم کردیا تھا، حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو بھی یہ معلوم تھا اور کسی صحابی سے بھی اس کے خلاف منقول نہیں ہے۔ حدیث نعمان بن بشیرؓ سے بھی ایک حد تک یہ مسئلہ مستفاد ہوتا ہے، اگر بشیر نے سب اولاد کو ہبہ کیا ہوتا تو وہ ہبہ درست قرار پاتا اور تقسیم کی صورت کے لیے مناسب ہے کہ میراث کے ضابطہ کی پیروی کرتے ہوئے ہر ایک وارث کو اس کے حصۂ میراث کے بقدر دے۔

۲- دونوں ہی صورت جائز ہے لیکن جیسا کہ سابقہ سطور میں (زیر عنوان ''ہبہ میں عدل بین الاولاد کا معنی'') بیان ہوا کہ ائمہ کی ایک جماعت قاضی شریح، امام عطاء، امام محمد، امام احمد، امام اسحاق بن راہویہ اور بہت سے علمائے شافعیہ و مالکیہ۔ اسی طرح امام شیخ الاسلام ابن تیمیہ، امام ابن القیم، علامہ نواب صدیق حسن خانؒ، متعدد علمائے سعودیہ علامہ ابن باز وغیرہ اور سعودیہ کی فتویٰ کمیٹی (لجنۃ دائمۃ للبحوث العلمیہ والافتاء) کے نزدیک حق و صواب اور عدل یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ ضابطہ عدل قانون میراث کے مطابق بیٹے کو بیٹی کے دوگنا دے۔

۳- تقسیم جائداد ترکہ کے طور پر تقسیم کررہا ہے تو بیوی کو بھی ترکہ میں جو اس کا حصہ ہوتا ہے اس کے بقدر دے، یا پھر کسی مصلحت کی بنا پر کچھ کم دینا چاہتا ہے یا دینا ضروری یا اس کی ضرورت نہیں سمجھتا تو یہ بھی جائز ہے، چونکہ زندگی میں تقسیم جائداد ہبہ ہے اور جیسا کہ حدیث نعمان بن بشیر کی تشریح میں گذرا کہ اولاد کو ہبہ کرنے کی صورت میں دیگر ورثاء بیوی وغیرہ کو بھی دینا اور ہبہ

کرنا ضروری نہیں ہے، ملاحظہ ہو مسئلہ سوم لیکن صورت مسئولہ میں چونکہ زید تقسیم ترکہ کے طور پر اپنی جائداد تقسیم کرر ہا ہے، اس لیے بیوی کو نہ دینا کسی طرح مناسب نہیں ہے، بالخصوص جب کہ اضرار مقصود ہو۔اسی طرح بیوی کو اس کے حصۂ میراث سے خواہ مخواہ زیادہ دینا بھی مناسب نہیں ہے۔

۴- سب تو اسی کا ہے جتنا چاہے محفوظ رکھے، اس کی تعیین نہیں کی جاسکتی، یہ اس کی صواب دید، اس کی ضرورت اور پیش نظر مجوزہ تقسیم کی مصلحت پر موقوف ہے۔اپنے گذر بسر کے لیے جتنا بچانے کی ضرورت سمجھتا ہے اتنا بچا سکتا ہے، اس کی وفات کے بعد وہ ترکہ ہو جائے گا جو اس کے ورثاء میں حسب قانون میراث تقسیم ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حوالے

(۱) اکثر روایات میں ''غلام'' ہی عطیہ دینا مذکور ہے، صرف طبرانیؒ وابن حبان کی ایک روایت میں جو بطریق ابی حریز مروی ہے، غلام کے بجائے باغ (حدیقہ) دینے کا ذکر ہے۔ (۲) مثلاً جمہور کی ایک دلیل ہے کہ یہ مسئلہ متفق علیہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنا کل یا جزء مال اپنی اولاد کے علاوہ کسی اجنبی کو ہبہ کردے تو یہ ہبہ صحیح ہے (اتفقوا علی ان للانسان ان یھب جمیع مالہ للاجنبی -بدایہ ابن رشد (ج ۲،ص ۴۹۱) نیز فتح الباری ج ۵، ص ۲۱۵) اسی طرح خود اولاد کے درمیان بھی تفاضل وتخصیص جائز ہے کہ بعض کو دے بعض کو نہ دے یا کم وبیش دے، لیکن یہ قیاس اولاً تو نص کے بالمقابل ہے جو از روئے اصول جائز نہیں، ثانیاً یہ قیاس مع الفارق بھی ہے، اولاد میں تفاضل وتخصیص کی صورت میں ان کے درمیان جو باہم رنجش ونزاع، غضب وعداوت کا اندیشہ ہے وہ اجنبی کو دینے کی صورت میں نہیں ہے، کما لایخفی۔ (فتح الباری ومحلی ابن حزم) (۳) یہ روایت ضعیف ہے، اس کی سند میں سعید بن یوسف الرحبی راوی بالاتفاق ضعیف ہے، امام ابن عدی نے کہا کہ یہ اس کی سب سے زیادہ منکر روایت ہے۔ (الضعیفہ ا؍حدیث ۳۴۰، الارواء ۶ حدیث ۱۶۲۸)۔ (۴) میراث کے معاملہ میں یہ اولین اصولی ہدایت ہے کہ مرد کا حصہ عورت کے دوگنا ہے، چونکہ اسلامی شریعت نے خاندانی زندگی میں مرد پر زیادہ معاشی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا ہے اور عورت کو بہت سی معاشی ذمہ داریوں کے بار سے سبک دوش رکھا ہے، لہذا عدل و انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ میراث میں عورت کا حصہ مرد کی بہ نسبت کم رکھا جائے۔ (تفہیم القرآن: سورہ نساء ۱۱؍)۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے بھی ترکہ میں عورتوں کو کم دینے پر بڑی منطقیانہ بحث کی ہے: ''دنیا کی بہت سی مذہبی اور غیر مذہبی شریعتیں ایسی ہیں جن میں لڑکی کا سرے سے کوئی حصہ نہیں ہے اور عرب جاہلیت میں بھی ترکہ کے حصہ دار صرف مرد (اور مردوں میں بھی بالغ اور قابل جنگ مرد) تھے، ایسے قانون کا ظالمانہ اور خلاف

فطرت ہونا بالکل ظاہر ہے لیکن اب اس کے ردعمل کے طور پر بعض حلقوں سے جو یہ صدا اٹھی ہے کہ مرد و عورت کا حصہ مساوی ہونا چاہیے، یہ دوسری بے اعتدالی اور افراط کی جگہ تفریط ہے، عورت کی فطری ساخت، جسمانی ترکیب اور عضویاتی فرائض نے اسے اس قابل ہی نہیں رکھا ہے کہ تربیت نسل کے ساتھ ساتھ اس پر فکر معاش کی ذمہ داریاں بھی ڈال دی جائیں، قدرت نے اور اس لیے صحیح اور سچی شریعت نے اس کا ذمہ دار مرد کو ٹھہرایا ہے، گھر اور خاندان کا خرچ چلانا اس کے سر رکھا ہے، اس لیے یہ ظلم نہیں عین عدل ہے کہ ترکہ میں اسے حصہ بھی برابر ملے، پھر شادی کے بعد عورت کو حصول میراث کے موقع پر دوسرے حصے حاصل رہتے ہیں، ایک ادھر باپ کے ترکہ میں حصہ، دوسرا اُدھر سسرال میں شوہر کے ترکہ میں حصہ، اس طرح صوری اور ظاہری اعتبار سے بھی عورت گھاٹے میں نہیں رہتی"۔ (تفسیر ماجدی: سورۂ نساء/۱۱)۔ (۵) مثلاً جمہور کی ایک بڑی دلیل حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ایک قول ہے، "حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عائشہؓ کو بیس وسق کھجور ہبہ کیا کہ وہ اسے میرے باغ سے توڑ لیں لیکن انہوں نے حاصل نہیں کیا، حضرت ابوبکرؓ نے بوقت احتضار حضرت عائشہؓ سے کہا تم نے توڑ لیا ہوتا، لے لیا ہوتا تو وہ کھجوریں تمہاری تھیں لیکن اب تو وہ ورثاء کی ہیں، تمہارے بھائی بہن سب کی ہیں"۔ (موطا امام مالک بسند صحیح)۔ حضرت عائشہ نے چونکہ شئی موہوب پر قبضہ نہیں کیا، اسی لیے حضرت ابوبکر نے اس ہبہ کو واپس لے لیا، معلوم ہوا کہ قبضہ کے بغیر ہبہ صحیح یا تام نہیں ہوتا، اگر حضرت عائشہؓ نے قبضہ کرلیا ہوتا تو حضرت ابوبکر واپس نہ لیتے، مگر یہ استدلال مخدوش ہے کیونکہ حضرت ابوبکر کو تو بحیثیت والد حضرت عائشہ کے شئی موہوب پر قبضہ کے بعد بھی اسے واپس لینے کا اختیار تھا، جیسا کہ اوپر حدیث گذری "لا یرجع فی هبة الا الوالد من ولده"۔ حضرت ابوبکر کا یہاں واپس لینا اس وجہ سے نہیں تھا کہ حضرت عائشہؓ کا شئی موہوب پر قبضہ تام نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ عطیہ آپ نے صرف حضرت عائشہ کو دیا تھا، اپنے دوسرے بیٹے یا بیٹی کو نہیں دیا تھا اور یہ خلاف عدل تھا، اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے اس کی تلافی واصلاح کے لیے واپس لیا۔ چنانچہ ایک روایت میں خود حضرت ابوبکر سے اس کی صراحت وارد ہے، امام ابن حزم نے بہ سند صحیح روایت کیا ہے کہ حضرت ابوبکر نے عائشہؓ صدیقہ سے کہا: "یا بنية انی نحلتك نخلا من خيبر وانی اخاف ان اكون آثرتك على ولدی انك لم تكونی احتزيته فرديه على ولدی ؟ فقالت يا ابتاه لو كانت لی خيبر بجدادها لرددتها"۔ (محلی، ج ۱۰ ر مسئلہ ۱۶۳۰ و ۱۶۳۴) بیٹی میں نے تم کو اپنے نخلستان خیبر سے کچھ کھجور عطیہ دیا تھا، مجھے ڈر ہے کہ میں نے تمہیں اپنے دوسرے بچوں پر ترجیح دی ہے، بیشک تم نے کھجوریں ابھی توڑی بھی نہیں ہیں تو کیا تم اسے میرے بچوں کو واپس کردوگی؟ کہ وہ میراث میں تقسیم ہو؟ حضرت عائشہ نے جواب دیا: کہ "اے والد بزرگوار اگر پورا نخلستان خیبر بھی ہوتا تو میں اسے واپس کردیتی"۔

خطابی کی "کتاب بیان اعجاز القرآن" اور پروفیسر عبدالعلیم

ڈاکٹر محمد نعمان خاں

قرآن نے اپنے معجز ہونے کا اعلان خود کیا ہے اور دنیا کے سامنے چیلنج کیا کہ قرآن جیسی دس سورتیں پیش کریں، یہ ممکن نہیں تو ایک سورت ہی اس جیسی لے آئیں۔ تاریخ گواہ ہے آج تک اس کا جواب نہ ہوسکا۔ رفتہ رفتہ اعجاز القرآن کے نظریہ نے ایک فن کی حیثیت اختیار کرلی اور چوتھی اور پانچویں صدی میں یہ فن پختہ ہوکر اہل علم کے سامنے آیا، اسی سے علم تنقید کو بھی فروغ ملا اور اس کی علمی وفنی حیثیت قائم ہوئی۔ قرآن کے اعجاز کے کئی پہلو ہیں جن میں بعض تو سامنے آچکے ہیں اور بعض کا انکشاف ہو چکا ہے اور آیندہ بھی ہوتا رہے گا۔ یہ سائنس وٹکنالوجی کا عہد شباب ہے اور اہل علم کے سامنے قرآن کے سائنسی پہلو بتدریج سامنے آرہے ہیں۔ خطابی کی "اعجاز القرآن" قرآن کے اعجازی پہلوؤں کو نمایاں کرتی ہے، اہل علم نے اس کی جانب خصوصی اعتنا کیا ہے، ان ہی میں ایک نام پروفیسر عبدالعلیم کا بھی ہے۔

پروفیسر عبدالعلیم صاحب (۲۵/اگست ۱۹۰۶ء - ۱۸/فروری ۱۹۷۶ء) کا شمار ہندوستان کی معتبر علمی شخصیات میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق غازی پور کے پتھیا/سرولی گاؤں سے ہے۔ ان کی شخصیت کے متعدد دوسرے پہلوؤں سے قطع نظر یہاں ان کے اعجاز القرآن پر کیے گئے کام پر روشنی ڈالی جائے گی۔

ڈاکٹر عبدالعلیم نے ۱۹۳۱ء میں برلین جرمنی سے اعجاز القرآن کے موضوع پر اسلامک اسٹڈیز

پروفیسر شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی لیکن ان کے مقالے کی کاپیاں بقول ڈاکٹر عبدالعلیم کے قرول باغ میں ۱۹۴۷ء کے فسادات کی نذر ہو گئیں اور اس کی کوئی نقل ہندوستان میں موجود نہیں ہے البتہ اس کا اردو اور انگریزی ترجمہ موجود ہے، اردو ترجمہ ۱۹۴۰ء کے آس پاس مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے شائع ہوا، اس کا دیباچہ ڈاکٹر سید عابد حسین نے تحریر کیا تھا، انگریزی ترجمہ (Islamic Culture) حیدرآباد میں دو قسطوں میں ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ پھر جامعہ پریس دہلی نے ۱۹۳۶ء میں کتابی شکل میں "A Historical Survey of Dogma I'jazul Qur'an" کے نام سے شائع کیا۔ اصل نسخہ غالباً اب بھی برلین یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع سے متعلق عربی کی دوسری قدیم کتابوں پر بھی کام کیا، ان کی یہ کاوش دو رسالوں اور ایک مضمون کی شکل میں موجود ہے:

۱- کتاب النکت فی اعجاز القرآن / ابوالحسن علی بن عیسیٰ الرمانی، مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی ۱۹۳۴ء۔

۲- البیان فی اعجاز القرآن / احمد بن محمد الخطابی (۳۱۹-۳۸۸ھ)، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس، ۱۹۵۳ء۔

۳- رای الشریف المرتضی فی اعجاز القرآن (The Muslim University Journal Vol.II No.3)۔

اس کے دو اہم موضوع پر ان کے لکچر اور خطبے شائع ہوئے، جس کی تفصیل یہ ہے:

۱- ۸/ نومبر ۱۹۵۵ء میں "ہندوستان میں عربی ادب اور علوم اسلامیہ کی تدریس و تحقیق"، کے عنوان سے ایک توسیعی لیکچر جس کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ۱۹۵۶ء میں کتابچہ کی شکل میں شائع کیا۔

۲- انڈین اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز میں (Background of Persent Tensions in Arab World 1798-1914) کے عنوان سے ۴/ فروری ۱۹۵۶ء کو ایک افتتاحیہ خطبہ پڑھا جو Indian Quarterly, Vol.XII, No.4, October-December 1956) میں شائع ہوا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ پچاس کی دہائی اور ۱۹۶۰ء میں قرآن کے اعجاز و بیان کے موضوع

پر جو مختلف کتابیں قاہرہ سے شائع ہوئیں، اس کی ابتدا خطابی کے رسالہ ''البیان فی اعجاز القرآن'' سے ہوتی ہے ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر عبدالعلیم کی تحقیق کے ساتھ علی گڑھ سے شائع ہوا، اسی سال یہ رسالہ قاہرہ سے بھی شائع ہوا تھا جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔ اس کے بعد ۱۹۵۵ء میں قاہرہ سے ابو عبیدہ (معمر بن مثنیٰ ت ۲۱۰ھ) کی مجاز القرآن، اعجاز القرآن کے نام سے شائع ہوئی (بعد میں اس کا ایک اچھا ایڈیشن دو جلدوں میں جرمن میں مقیم ترکی عالم فواد سزگین کی تحقیق و تدوین کے ساتھ قاہرہ سے شائع ہوا اور ۱۹۷۰ء میں قاہرہ ہی سے دوسرا ایڈیشن شائع ہوا)، ۱۹۵۵ء ہی میں معروف لغوی و ادیب الفراء (ابوزکریا یحییٰ بن زیاد، وفات ۲۰۷ھ) کی معانی القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ یہ پہلی تفسیر ہے جس میں قرآن مجید کے مختلف اسالیب کو موضوع بحث بنا کر اس کے معانی و مفاہیم کا تعین کیا گیا ہے۔ اس کی پہلی دو جلدیں محمد علی النجار اور احمد یوسف نجاتی کی تحقیق کے ساتھ ۱۹۶۶ء میں قاہرہ ہی سے شائع ہوئیں۔ تیسری جلد قاہرہ سے ۱۹۷۳ء میں عبدالفتاح اسماعیل شلبی کی تحقیق کے بعد منظر عام پر آئی۔ اس کے بعد ابن قتیبہ دینوری (ت ۲۷۶ھ) کی مشہور کتاب مشکل القرآن (مشکلات القرآن) سید صقر کی تحقیق کے ساتھ قاہرہ سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔ (اس سے قبل اس کتاب کو مشہور جرمن مستشرق رٹر (Hellmut Ritter 1892-1971) نے ۱۹۲۹ء میں شائع کیا تھا، ایک ایڈیشن قاہرہ سے ۱۹۴۵ء میں بھی نکلا)، منہج الزمخشری فی تفسیر القرآن و بیان اعجازہ (ابوالقاسم جار اللہ محمود بن عمر، ت ۵۳۸ھ)، مصطفیٰ الصاوی کی تحقیق کے ساتھ اور معتزلی عالم قاضی عبدالجبار (بن احمد الاسد آبادی الہمذانی، ابوالحسن، ت ۴۱۵ھ) کی کتاب المغنی فی ابواب العدل والتوحید کی پندرہویں جلد اعجاز القرآن کے موضوع پر امین الخولی نے ۱۹۶۰ء میں شائع کیا اور یہ دونوں قابل قدر کتابیں قاہرہ ہی سے منظر عام پر آئیں۔

البیان فی اعجاز القرآن لحمد بن محمد الخطابی (۳۱۹-۳۸۸ھ) بہ تحقیق ڈاکٹر عبدالعلیم:

ڈاکٹر عبدالعلیم نے الخطابی کے رسالہ کو البیان فی اعجاز القرآن کے عنوان سے ۵۱ صفحات میں شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۹۵۳ء میں شائع کیا تھا جو خلیل شرف الدین کے پریس بمبئی (موجودہ ممبئی) میں چھپا تھا۔ عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہے، اس کے بعد ۵۱ صفحات کے علاوہ ابجدی ترتیب سے (الف تا لام) بارہ صفحات ہیں جن میں

شروع کے دو صفحے تصحیح اغلاط اور استدراک اور دو مقدمہ پر مشتمل ہیں، سات صفحے میں الخطابی کے سوانح اور اشعار ہیں اور آخری صفحہ میں اصل کتاب میں مذکور قوافی کی فہرست ہے۔اس کے بعد (۱تا۵۱) صفحات میں اصل متن ہے۔

مقدمہ: مقدمہ میں الخطابی کے نسب کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ نسب نامہ انہیں پروفیسر عبدالعزیز میمنی نے دیا ہے جوانہوں نے دارالکتب، قاہرہ میں موجود صاغانی کی کتاب العباب الزاخر واللباب الفاخر کے مقدمہ (ص ۳ب) سے نقل کیا تھا۔اس میں الخطابی کا نام حمد بن محمد درج ہے اور پانچویں پشت پر ختم ہو جاتا ہے، جب کہ یاقوت الحموی کی معجم الادباء نے مصنف کا نام احمد بن محمد اور سلسلہ نسب صرف دو پشت تک تحریر کیا ہے، البتہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ الخطابی حضرت عمر فاروقؓ کے بھائی حضرت زید بن الخطاب کی نسل سے ہیں (ص ج اور ہ)۔ان کی نسبت الخطابی اسی وجہ سے ہے۔

البیان کا مخطوطہ: ڈاکٹر عبدالعلیم کو البیان فی اعجاز القرآن کا صرف ایک ہی نسخہ مل سکا جو لائڈن میں محفوظ ہے۔کتاب مکمل ہونے پر عرب لیگ، قاہرہ کے جناب رشاد عبدالمطلب نے انکشاف کیا کہ اس کا دوسرا نسخہ مغربی رسم الخط میں دارالکتب قاہرہ میں موجود ہے، لیکن یہ نسخہ ڈاکٹر صاحب کو دستیاب نہ ہو سکا۔۱۹۵۳ء میں وہی نسخہ شائع ہوا، جس کی تفصیل ثلاث رسائل کے ضمن میں آرہی ہے، بظاہر اس ایڈیشن کو زیادہ شہرت حاصل نہ ہو سکی، لائڈن کے مخطوطہ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

> یہ ایک عمدہ اور صاف خط میں تحریر کیا ہوا نسخہ ہے، اس میں اعراب کا بھی اہتمام کیا گیا ہے، کتابت کی غلطی کے سبب بعض الفاظ پڑھنے میں دقت ہوئی، ایسے الفاظ کی تصحیح کی پوری کوشش کی گئی ہے۔

البیان...... کی الخطابی کی طرف نسبت: ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

> اعجاز القرآن کے موضوع پر خطابی کے کسی رسالہ کا ذکر نہ تو یاقوت الحموی نے کیا ہے اور نہ ہی ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ یا سبکی نے طبقات الشافعیہ یا ثعالبی نے الیتیمہ میں اور نہ ہی کسی اور تذکرہ نگار نے کیا ہے، البتہ السیوطی کی الاتقان (۱۲۱/۲) اور طاشکبری زادہ کی مفتاح السعادۃ

(۳۵۱/۲) خطابی کے رسالہ اعجاز القرآن کا ذکر ہے۔ السیوطی کی دوسری کتاب بغیۃ الوعاۃ میں بھی اس رسالہ کا کوئی ذکر نہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مقدمہ میں ڈاکٹر مختار الدین احمد اور پروفیسر عبدالعزیز میمنی کا شکریہ ادا کیا ہے کہ ان مایہ ناز محققین نے مخطوطہ کی نقل، اس میں مذکور اشعار کی توثیق و تخریج اور بعض الفاظ کی تصحیح وغیرہ میں معاونت کی تھی۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین کی عربی شعبہ پر عنایت اور مفید عربی کتب کی اشاعت کی طرف توجہ کا اعتراف کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا ہے۔ یہ مقدمہ ۲۶ فروری ۱۹۵۳ء کو لکھا گیا ہے۔

الخطابی کی سوانح حیات: الخطابی کے سوانح زیادہ تر معجم الادباء اور اشعار الثعالبی کی یتیمۃ الدہر (الیتیمۃ) سے نقل کیے گئے ہیں، اس کے علاوہ السبکی کی طبقات الشافعیہ، الذہبی (کی سیر اعلام النبلاء)، (ابن خلکان کی وفیات الاعیان) سے بھی استفادہ کیا گیا ہے اور الخطابی کی تالیفات کے مخطوطات کی نشان دہی بروکلمان کی تاریخ ادب عربی :GAS سے کی گئی ہے، ذاتی سوانح سے متعلق حاصل شدہ معلومات کا موازنہ و مقارنہ اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ مصنف کی زندگی کے تقریباً تمام پہلو سامنے آجائیں۔

اسلوب تحقیق: رسالہ کی تحقیق کے لیے ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر صرف ایک ہی نسخہ ہے اور مخطوطہ کے متعلق صرف یہ کہا ہے کہ اس کی اصل کاپی لائڈن میں موجود ہے اور اس کی فہرست میں اس کا نمبر ۹۵۵ ہے، اس کا خط واضح ہے اور اس پر زیر، زبر اور پیش لگے ہیں، لیکن یہ نہیں بتایا کہ یہ خط نسخ، نستعلیق یا کس خط میں تحریر ہے، حاشیہ میں متن کے وہ الفاظ دیے گئے ہیں جن کی تصحیح کی گئی ہے مثلاً پہلے صفحہ پر چار الفاظ درست کیے گئے ہیں، حمد (اصل میں: حمید تھا)، نقیت ...... نقیۃ (اصل میں :لقیت ......لقیۃ) اور التنکیر (اصل میں :النکیر)۔ قرآن مجید کی آیات کے لیے حاشیہ میں سورہ اور آیت نمبر دیے گئے ہیں، صرف ایک جگہ (ص ۸) القرآن لکھ کر سورہ کا نمبر اور آیت نمبر دیے گئے ہیں۔ عربی کتابوں میں اس طریقہ کا رواج نہیں ہے، عربی کتابوں، سورہ کا نام اور آیت کا نمبر لکھا جاتا ہے اور بعض حضرات سورہ کے نام کے بعد بین القوسین سورہ کا نمبر بھی لکھ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نے آیات کے سلسلے میں وہ طریقہ اختیار کیا ہے جو مغربی زبانوں میں

اختیار کیا جاتا ہے۔ آیات لکھنے کے لیے خاص قوسین کا استعمال کیا جاتا ہے، غالباً وہ قوسین پریس میں دست یاب نہیں تھے اس لیے آیات عام عبارتوں کی طرح نقل کی گئی ہیں۔ کتاب میں مذکور اشعار کی تخریج کی گئی ہے کہ اشعار کہاں اور شعر و ادب کی کن کتابوں میں ہیں۔ غیر منسوب اشعار کو ان کے شعرا کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اتنے طویل متن میں کہیں کوئی عنوان نہیں مخطوطہ میں تو حرکات (زبر، زیر، پیش) کا اہتمام کیا گیا ہے لیکن مطبوعہ محقق ایڈیشن میں کہیں بھی اعراب کا استعمال نہیں کیا گیا ہے، حالانکہ قرآنی آیات، اشعار اور بعض الفاظ اور ناموں کو صحیح پڑھنے میں دشواری کے پیش نظر اعراب ضروری تھا، بسا اوقات اعراب کے بغیر عربی میں قافیہ جاننا دشوار ہو جاتا ہے، اعراب کے بغیر بہت سے عربی الفاظ و اسماء کا تلفظ درست نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کتاب کو ایڈٹ کرتے وقت اس بات کی جانب خصوصی توجہ دی جاتی ہے، تحقیق و مراجعت کے موجودہ طرز کے مطابق کتاب کی مختلف فہرستیں تیار کی جاتی ہیں جس سے کتاب و تحقیق کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اس ایڈیشن میں قوافی کی فہرست کے علاوہ کوئی فہرست نہیں ہے۔ اسی طرح مآخذ کی بھی کوئی فہرست نہیں دی گئی ہے، کہیں صرف مصنف کے نام (مثلاً الذہبی) اور کہیں کتاب کے نام (مثلاً العقد الثمین) پر اکتفا کیا گیا ہے، محقق نے مآخذ کے متعلق مکمل معلومات بھی فراہم نہیں کی ہے، ایڈٹ کا یہ انداز جدید طرز کے مطابق نہیں ہے۔

کتاب میں م، ع، اور مرجلبوت وغیرہ جیسے الفاظ و حروف کا بھی استعمال کثرت سے کیا گیا ہے جن کو سمجھنا قاری پر چھوڑ دیا گیا ہے جیسے م (پروفیسر مختار الدین احمد)، ع (پروفیسر عبدالعلیم) مرجلبوت (صفحہ: ح) (یاقوت الحموی کی معجم الادباء کے لیے، اس کے ایڈٹ کرنے والے مستشرق D.S. Margoliuth کی طرف اشارہ ہے)، ق (؟)۔

البیان فی اعجاز القرآن کے دوسرے مصری ایڈیشن (ثلاث رسائل فی اعجاز القرآن) کے محققین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ پہلے ایڈیشن میں بعض عبارتیں جو مشتبہ تھیں، ان کی تصحیح کے لیے ڈاکٹر عبدالعلیم کا شائع کردہ نسخہ معاون ثابت ہوا لیکن ان کی رائے میں علی گڑھ کے ایڈیشن میں کافی غلطیاں ہیں اور وہ تصحیف کا بھی شکار رہا ہے، جس کی وجہ سے اس کی قدر و قیمت کم ہوگئی ہے (ثلاث رسائل ...... ص ۱۳)۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کے ایڈیشن اور مصری ایڈیشن کے

موازنہ کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر عبدالعلیم کے شائع کردہ الخطابی (حمد بن محمد، م ۳۸۸ھ) اور الرمانی (ابوالحسن علی بن عیسیٰ الرمانی، م ۳۸۴ھ) کے رسالے مصر سے دوبارہ شائع ہوئے ہیں، لیکن محققین کو ڈاکٹر صاحب کا شائع کردہ الرمانی کا رسالہ دست یاب نہیں ہوسکا جس کی وجہ سے وہ اس سے استفادہ نہیں کرسکے۔ یہ رسالہ ''ذخائر التراث'' میں ڈاکٹر صاحب کے نام کے ساتھ شامل ہے لیکن ہندو پاک میں مطبوعہ عربی کتابوں کی فہرست ''معجم المطبوعات'' میں اس کا ذکر ڈاکٹر صاحب کے نام کے بغیر ہے۔ یہاں الخطابی کے رسالہ کے مصری ایڈیشن پر بھی ایک نظر ڈالنا مناسب سمجھتے ہیں۔

البیان فی اعجاز القرآن کا مصری ایڈیشن: الرمانی اور الخطابی کے دونوں مذکورہ رسالوں کو جنہیں ڈاکٹر عبدالعلیم نے (۱۹۳۴ء اور ۱۹۵۳ میں بالترتیب) شائع کیا تھا، الجرجانی (ابوبکر عبدالقاہر بن عبدالرحمٰن) کے الرسالۃ الشافیۃ کے ساتھ محمد خلف اللہ اور ڈاکٹر محمد زغلول سلام نے ۱۹۵۶/۱۹۵۵ میں تحقیق و مطالعہ کے ساتھ شائع کردیا ہے اور تینوں رسالوں کے مجموعہ کو ''ثلاث رسائل فی اعجاز القرآن للرمانی والخطابی وعبدالقاہر الجرجانی فی الدراسات القرآنیہ والنقد الادبی'' کا عنوان دیا ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن قاہرہ (دار المعارف بہ مصر) سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا ہے، وہی اس وقت پیش نظر ہے۔

اس مجموعہ میں عنوان کی ترتیب غلط ہے کیوں کہ ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کے ایڈٹ کردہ مجموعہ جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا میں پہلا رسالہ الخطابی، دوسرا الرمانی اور تیسرا عبدالقاہر الجرجانی کا ہے اور محمد خلف اللہ اور ڈاکٹر محمد زغلول سلام کے تحقیق شدہ ایڈیشن میں یہ ترتیب نہیں ہے۔

مجموعہ رسائل کی تدوین و تحقیق میں ڈاکٹر عبدلعلیم کے ایڈیشن سے استفادہ کیا گیا ہے، اس کی اہمیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عبدالعلیم نے یہ لائڈن میں محفوظ نسخہ سے شائع کیا تھا جو اس مجموعہ کے محققین کو نہیں مل سکا۔ الخطابی کے رسالہ کو ایڈٹ کرنے کے لیے محمد خلف اللہ اور ڈاکٹر محمد زغلول سلام نے تین نسخوں کا استعمال کیا ہے:

۱- دار الکتب، قاہرہ میں مغربی خط میں موجود مخطوطہ جو مکتبہ صدیقیہ، طنجہ میں موجود

مخطوطہ سے نقل کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ مندرجہ ذیل دو مطبوعہ نسخے بھی ان محققین کے پیش نظر رہے ہیں۔

۱- سید عبداللہ الصدیق کا شائع کردہ نسخہ جو قاہرہ سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا اور چھوٹے سائز کے ۱۲۵ صفحات پر مشتمل ہے، یہ دراصل دارالکتب، قاہرہ کے مخطوطے سے شائع کیا گیا ہے لیکن محقق یا ناشر نے عبارتوں میں تصرف کیا ہے اور بلاضرورت تاویل کا سہارا لیا ہے۔ کتاب میں آنے والی احادیث و روایات اور دیگر معلومات کی حاشیہ میں تشریح گئی ہے۔(دیکھیے ثلاث رسائل ۱۲-۱۳)

۲- ثلاث رسائل کے محققین نے پہلے ایڈیشن کی بعض عبارتوں کی تصحیح میں ڈاکٹر عبد العلیم کے مطبوعہ نسخے سے بھی مدد لی ہے۔(دیکھیے ثلاث رسائل ۱۳)

اسی مجموعہ رسائل کے شروع میں دوسرے ایڈیشن کا چھوٹا سا مقدمہ ہے، اس کے بعد (ص ۷-۱۸) اصل مقدمہ ہے جس میں تینوں رسائل کا تحلیلی جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے مصنفین کے بارے میں بھی تفصیلات تحریر کی گئی ہیں۔(ص ۸ تا ۹) الخطابی کی زندگی کے حالات، ان کی علمی خدمات اور ان کی تالیفات وغیرہ کا ذکر ہے۔حاشیہ میں ان کے سوانح کے مآخذ و مراجع کا ذکر ہے جن میں آٹھ مطبوعہ اور ایک مخطوطہ ہے۔(ص ۱۱-۱۴) میں بیان اعجاز القرآن کا تحلیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔شروع میں مخطوطہ اور اس پر موجود اجازت (سند) کا ذکر ہے جس پر سلسلہ روایت اور سن ۵۶۲ھ درج ہے، اسی طرح مخطوطہ سے متعلق ہر طرح کی معلومات درج ہیں۔سنۂ کتابت ۱۰۰۶ھ ہے۔اس کے بعد السید عبداللہ الصدیق اور ڈاکٹر عبدالعلیم کے مطبوعہ نسخوں کے متعلق رائے دی گئی ہے۔آخر میں رسالہ کے مرکزی خیال اور اس کو پیش کرنے کے اسلوب و انداز پر بحث کی گئی ہے۔

متن: متن ص ۱۹ سے ۷۲ تک ہے۔مخطوطہ کے متن کا دونوں نسخوں سے موازنہ کیا گیا ہے، عبداللہ الصدیق کے ایڈیشن کی طرف (ا) سے اور کہیں (ص) سے اشارہ کیا گیا ہے۔ڈاکٹر عبدالعلیم کے ایڈیشن کے لیے (ب) کا رمز اختیار کیا گیا ہے۔آیتیں مع اعراب کے قوسین میں سورتوں کے نام اور نمبرات کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔کہیں کہیں مختصر تبصرے اور مشکل الفاظ کی تشریح بھی کی گئی ہے۔مآخذ و مراجع کی کوئی مستقل فہرست تو نہیں دی گئی لیکن حاشیہ میں کتاب سے

متعلق ضروری معلومات فراہم کیے گئے ہیں۔

مآخذ

(۱) ثلاث رسائل فی اعجاز القرآن للرمانی والخطابی وعبدالقاہر الجرجانی فی الدراسات القرآنیہ والنقد الادبی، تحقیق وتحشیہ: محمد خلف اللہ و ڈاکٹر محمد زغلول سلام، دار المعارف بمصر، قاہرہ (ط۲) ۱۳۸۷ھ/۱۹۶۸ء۔ (۲) ذخائر التراث العربی الاسلامی (۱۹۸۰ء تک شائع ہونے والے عربی اسلامی مخطوطات کی فہرست) /عبدالجبار عبدالرحمٰن، بغداد (ط۱) ۱۹۸۱ء۔ (۳) معجم المطبوعات العربیۃ فی شبہ القارۃ الہندیۃ الباکستانیۃ (۱۹۸۰ء تک ہند و پاک میں عربی مطبوعات کی فہرست) /ڈاکٹر احمد خان، الریاض ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء۔ (۴) یہاں ڈاکٹر عبدالعلیم کے مآخذ کا حروف تہجی کے اعتبار سے ذکر کیا جاتا ہے۔ کتاب اور مصنف سے متعلق ضروری معلومات سطور بالا میں گزر چکی ہیں۔ الاتقان (فی علوم القرآن) /السیوطی (عبدالرحمٰن بن ابی بکر، ت ۹۱۱ھ) ج۔ الاغانی ۳۳، ۴۴۔ براکلمان و، ز۔ تاج العروس ۲۱، ۲۳، ۲۴، ۲۸، ۲۹۔ تاریخ الطبری (ج۱) ۳۶۔ تہذیب الالفاظ / ابن السکیت۔ جمہرۃ اشعار العرب ۲۵ س۔ الحماسۃ البصریۃ ۳۳۔ حیاۃ الحیوان للدمیری ک۔ (کتاب الحیوان /الجاحظ ۲۱۔ خزانۃ الادب ۲۱، ۲۹، ۳۳۔ دیوان الاخطل ۴۳۔ دیوان الاعشیٰ ۴۳۔ دیوان الحماسۃ ۲۳۔ دیوان ذی الرمۃ ۵۔ دیوان عروۃ بن الورد ۲۳۔ دیوان علقمہ بن عبدۃ۔ ذکری حبیب (دیوان حسان بن ثابتؓ) المطبعۃ المحمدیۃ، دہلی ۱۳۸۱ھ، ۴۴۔ الذہبی، ذ۔ روض الانف ۴۴۔ السبکی، ز، ک (طبقات الشافعیۃ للسبکی)۔ الکتاب /سیبویہ، ۲۱ (سیبویہ) ۳۳۔ سیرۃ ابن ہشام ۴۴۔ السیوطی؟ ۲۱۔ شرح تہذیب الالفاظ لابن السکیت /ابوزکریا التبریزی۔ صحاح الجوہری، ۲۱، ۲۳۔ الطبری (تفسیر؟)۔ العباب الزاخر واللباب الفاخر /الصاغانی (مخطوطہ دار الکتب المصریہ) ج۔ العقد الثمین ۲۵، ۲۶، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ہ۔ العینی ۳۳۔ القالی ۲۱، ۲۴۔ اللآلی ۲۱۔ اللسان ۲۱، ۲۳، ۲۴، ۲۸، ۲۹۔ مجالس ثعلب ۲۹۔ محاضرات الراغب ۳۳۔ المخصص /ابن سیدۃ ۲۴۔ (کتاب) المعانی الکبیر /ابن قتیبۃ ۲۴، ۲۹۔ معلقۃ الحارث ۲۷۔ معجم الادباء /یاقوت الحموی د، ہ، ز (الادباء)۔ معجم البلدان ۲۳، ۲۹۔ مفتاح السعادۃ /طاشکبری زادہ ج۔ الوفیات ز۔ الیتیمۃ /الثعالبی ہ، ح، ط (الثعالبی)، ی۔

عہد مغلیہ کے ایک بے نظیر خطاط خاندان کی ادبی خدمات

پروفیسر نورالسعید اختر

عہد مغلیہ کے ملکی اور غیر ملکی باکمالوں نے اپنے اپنے فن پاروں اور فنون لطیفہ کے جوہر دکھائے اور ان معارف پروروں اور قدر دانوں نے نہ صرف ان فن کاروں کو مال ومتاع بلکہ زرو جواہر کے علاوہ دیگر انعام واکرام سے ہر اہم موقع پر نوازا۔ نقاشوں، مصوروں، معماروں اور دیگر فنون لطیفہ کے ماہر فن کاروں کو مغل شہنشاہ اکبر (۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء)، جہاں گیر (۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۸ء) اور شاہ جہاں (۱۶۲۸ء تا ۱۶۵۸ء) نے بے مثال شاہانہ فیاضیوں اور داد و دہش سے ان فن کاروں کے حوصلے بڑھائے بلکہ انہیں علم وادب کے میدان میں منثور ومنظوم شاہ کار پیش کرنے کے لیے مواقع فراہم کیے۔ مولانا میر محمد صالح کشفی اور ان کے خانوادے کا شمار ان برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے فنون لطیفہ، ادب اور شاعری میں بے مثال کارنامے یادگار چھوڑے۔

مولانا میر محمد صالح کشفی مغلیہ دور کے بے نظیر ہنرمندوں میں شمار ہوتے ہیں۔ کشفی ایک صالح بزرگ، صوفی صافی، کہنہ مشق شاعر، صاحب طرز نثر نگار، بے عدیل خطاط، فن موسیقی کے ماہر اور موصوف مختلف زبانوں پر خاطر خواہ عبور رکھتے تھے، کشفی کے والد ماجد کا نام میر عبداللہ ترمزی تھا اور وہ اکبری دور کے ماہر خطاط تھے۔ بادشاہ وقت اکبر اعظم نے انہیں ''مشکیں قلم'' کے خطاب سے نوازا تھا۔ کشفی کا خاندانی سلسلہ شاہ نعمت اللہ ولی کوہستانی سے مربوط ہے۔ شاہ صاحب ۱۴۳۱ء میں وفات پائی اور موصوف کا مقبرہ کرماں (ایران) کے نزدیک ایک سرسبز وشاداب دیہات ماہان میں موجود ہے۔ شاہ صاحب نعمت اللہی صوفیانہ سلسلہ کے بانی تسلیم کیے جاتے ہیں۔ بے شمار ہندوستانی موصوف کے عقیدتمندوں میں سے ہیں۔ موصوف کا مقبرہ ہزاروں نعمت اللہی درویشوں اور صوفیوں کی عبادت گاہ بنا رہتا ہے۔

امریکا۔

مرحوم شاہ صاحب خود بھی ایک معتبر شاعر تھے، موصوف کے نثری کارنامے ملفوظات اور رسائل کی شکل میں موجود تھے جن کی تعداد ۵۰۰ سے متجاوز تھی لیکن اب صرف ۱۰۰ کے قریب دستیاب ہیں۔ شاہ صاحب کا تخلص سیّد تھا، موصوف کے اشعار صداقت اور حقیقت پسندی کے جذبات سے سرشار ہیں، موصوف کے صوفیانہ عقائد دروں بینی، عشقِ مجازی اور عشق حقیقی کے بست وکشاد سے ہم آہنگ ہیں۔

دکن کے بادشاہ علاء الدین احمد شاہ بہمنی کے عہد ۱۴۳۵ء تا ۱۴۴۷ء میں شاہ صاحب کے ایک پوتے شاہ میر حبیب اللہ ہندوستان آئے تھے۔ موصوف سلطان احمد شاہ بہمنی کے دربار میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے۔

میر محمد صالح کے والد میر عبداللہ بھی ایک خوش بیان شاعر تھے۔ میر عبداللہ ترمذی بھی فن خطاطی میں ماہر تھے۔ موصوف کو فن خطاطی کی سات اقسام پر مہارت تھی۔ میر عبداللہ کو ”مشکین قلم“ کا خطاب مغل بادشاہوں نے اس لئے بھی عنایت کیا تھا کہ موصوف نے اہل ہنود کی بیشتر مذہبی کتابوں اوران کی مقدس کتاب مہابھارت کے فارسی میں متعدد نسخے ترجمہ کئے تھے۔ میر عبداللہ نے ”سکندر نامہ“ اور ”تاریخ تیموری“ کے نسخوں کی بھی فنکارانہ کتابت کی جو فن خطاطی کی عمدہ مثالیں ہیں۔ بادشاہ وقت جلال الدین اکبر نے میر عبداللہ کی خدمات کے عوض ”وصفی“ کے تخلص سے سرفراز کیا تھا۔ چنانچہ وصفی نے ایک مثنوی اور ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے۔

وصفی کے تخلص اوران کے خطاب پانے کی بابت شمس العلماء ایم۔ اے۔ غنی صاحب نے موصوف ہی کا ایک شعر بطور ثبوت پیش کیا ہے۔

وصفی تخلصِ من و ”مشکین رقم“ خطاب
این نامہاز شاہ و شہنشاہ یافتم

(ماخوذ از: مراۃ العالم، مخطوطہ صفحہ نمبر ۷۴ تا ۷۶)

مورخین اور کچھ تذکرہ نگار اس بات پر متفق الرائے ہیں کہ میر عبداللہ عہد جہانگیر تک بقید حیات تھے۔ اس دعوے کے ثبوت میں منظوم تاریخی مادہ دیا جاتا ہے، جو جہانگیر کے صاحبزادے خسرو کی والدہ شاہ بیگم بنت راجہ بھگوان داس کی قبر پر کندہ ہے۔ میر عبداللہ نے اس

کتبہ میں فن خطاطی کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ میر عبداللہ کو جہانگیری عہد میں زندگی بسر کرنے پر فخر حاصل تھا۔

چوں گردشِ فلک زگردش خود آشفت
در زیر زمیں آئینہ مہر نہفت
تاریخ وفاتِ شاہ بیگم جستم
از غیب ملک مقلد ''شد بیگم'' گفت (۱۰۰۸ھ)

(کاتبہ عبداللہ مشکین قلم جہانگیر شاہی)

میر عبداللہ مشکین قلم کی خطاطی کا بہترین نمونہ الٰہ آباد کے قلعہ کے ایک ستون پر بھی نقش ہے۔ اس نقش میں جہانگیر کی تاج پوشی اور پہلے جشن جلوس کے علاوہ خاندانی شجرہ بھی موجود ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے ''جنرل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی بابت ۱۹۰۹ء صفحہ ۵۷۹ تا ۶۱۱)

وصفی کا انتقال ۱۰۲۵ھ م ۱۶۱۵ء میں ہندوستان میں ہوا۔ وصفی ''باگلہ جواہر'' آگرہ میں اپنے فرزند کے ہاتھوں مدفون ہیں۔ ۱۰۳۵ھ م ۱۶۲۵ء وصفی کے فرزند میر محمد صالح کشفی نے اپنے والد کی قبر پر مقبرہ تعمیر کروایا تھا۔ وصفی کی خطاطی کے بیش بہا آثار انڈیا آفس لائبریری لندن برٹش میوزیم لندن اور سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں موجود ہیں۔

میر عبداللہ مشکین قلم کی دو نرینہ اولادیں تھی۔ موصوف کے دونوں فرزند علوم متداولہ سے بہرہ ور اور فنون لطیفہ میں باکمال تھے۔ ان میں سے ایک ''مثنوی مجموعہ راز'' کا مصنف میر محمد صالح کشفی ہے، دوسرے فرزند میر محمد مومن المتخلص بہ عرشی ہیں جو فارسی زبان کے نامی گرامی شاعر تھے۔ یہ دونوں برادران مغلیہ دربار میں اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز تھے۔ میر عرشی ایک خوش گو شاعر ہی نہیں بلکہ نامور خطاط اور ہندوستانی موسیقی پر استادانہ کمال رکھتے تھے۔ ان دونوں برادران کے مسلم اور غیر مسلم شاگردان عزیز ان ماہر فن اساتذہ کے تلمیذ رشید ہونے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ میر محمد عرشی ۱۰۹۱ھ م ۱۶۸۰ء میں راہی ملک عدم ہوئے۔

سر تھامس بیل (Beale) نے اورینٹل ببلیوگرافی کے صفحہ نمبر ۷۹ پر یہ اطلاع دی ہے

کہ عرشی کے منظوم کاوشوں کے ایک دیوان کے علاوہ دو مثنویاں ہیں، ان میں سے ایک کا نام ''شاہد عرش'' اور دوسری مثنوی عشقیہ داستان پر مبنی ہے۔ اس مثنوی کا نام ''مہر و وفا'' ہے۔ جو خدائے سخن نظامی گنجوی کی مثنوی ''خسرو شیرین'' کی نہج پر لکھی گئی ہے۔

میر محمد عرشی کے بھائی میر محمد صالح کشفی ایک متبحر عالم، پاک طینت صوفی، فن خطاطی میں یکتائے زمانہ اور ہندوستانی موسیقی میں استادانہ درک رکھتے تھے۔ میر محمد صالح فارسی شاعری میں ''کشفی'' اور ہندی شاعری میں ان کا تخلص ''سجان'' تھا، کشفی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بحیثیت چشتیہ صوفیوں اور نعمت اللٰہی عارفوں کی طرح بسر کی تھی۔ انہیں بحالت مجبوری شہنشاہ شاہ جہاں کے اصرار پر درباری خطاط کا عہدہ تسلیم کرنا پڑا تھا۔ فارسی تذکروں میں پہلی مرتبہ کشفی کا حوالہ اس وقت آیا جب ۱۰۵۴ھ م ۱۶۴۴ء میں انہیں بادشاہ وقت شاہجہاں نے انعام کے طور پر کشفی کو ہتھنی بخشش کی تھی۔ دوسری مرتبہ کشفی کا حوالہ تاریخوں میں شاہجہاں کے جشن قمری کے موقع پر ملتا ہے۔ اس موقع پر بادشاہ وقت نے ۱۰۵۶ھ م ۱۶۴۶ء میں کشفی کو ایک لاکھ روپئے نقد انعام کے طور پر عطا کئے تھے، ان اعزازات اور نوازشات کے بعد شاہی کتاب داری کی ذمہ داری سے دست برداری کے بعد شاہجہاں نے کشفی کو کتب خانے کا نگراں بنادیا تھا۔ اسی سال ۲۲؍ جمادی الثانی کو کشفی کو ان کی خدمات کے عوض ۲۰۰ طلائی مہروں سے نوازا گیا تھا۔ ۱۰۵۷ھ م ۱۶۴۷ء میں جشن وزن قمری کے موقع پر کشفی کو اعلیٰ منصب سے سرفراز کیا گیا تھا۔

''تذکرہ عمل صالح'' کی تصدیق کے مطابق جشن وزن قمری کے موقع پر کشفی کو ''نہ صد سوار'' کا منصب عطا ہوا تھا، اسی تذکرے میں کشفی کی رحلت کی تاریخ بھی پائی جاتی ہے۔ کشفی نے شاہجہاں کے ۲۴ ویں سال جلوس میں ۱۴؍ شعبان ۱۰۶۱ھ م ۱۶۵۱ء میں اس جہان فانی کو خیر باد کہا تھا۔ کشفی کا جسد خاکی آگرہ میں ان کے والد کے مقبرے کے باہر دفن ہے۔ یہ مقبرہ کشفی ہی کا تعمیر کیا ہوا ہے۔ کشفی کے سال ارتحال کا کتبہ ملاحظہ فرمائیں:

میر صالح اہل عرفاں بود
صاحب کشف راز یزداں بود
زاد پاکش کہ از حق آگاہ است

لمعۂ نور نعمت اللہ است
عقل تاریخ آں شنود ہ نژاد
گفت کشفی بخلد آب بداد

کشفی کے خطاطی کے نمونے نایاب نہیں ہیں، ان کی فنکارانہ خطاطی کا ایک نادر نمونہ سرسالار جنگ لائبریری حیدرآباد کا مخزونہ ہے۔ جس پر محمد صالح کشفی کے دستخط ثبت ہیں۔ میر صالح کشفی کی خطاطی کے شاہکار انڈیا آفس لائبریری لندن اور یورپ کے دیگر کتب خانوں میں موجود ہیں۔ (دیکھئے مسٹر جانسن کی کتاب صفحہ نمبر ۱۱)

کشفی کو نظم ونثر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ کشفی کی منظوم ومنثور تصانیف سے صرف چند یک تصانیف ہماری دانست میں ہیں۔ کشفی کی دستیاب شدہ ادبی کاوشیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ مجموعہ راز: یہ ایک ترجیع بند ہیں۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۰۳۰ھ ہے لیکن فی الحال یہ ترجیع بند کمیاب ہے۔ اس میں تصوف کے اسرار ورموز کی عقدہ کشائی نہایت سلیس و پرکشش انداز میں کی گئی ہے۔ یہ ترجیع بند لکھنو سے لیتھوگراف ہو چکا ہے۔ برٹش میوزیم لندن کے کیٹلاگ نویس چارلس ریوٴ نے اس ترجیع بند کے اس نسخہ کا صفحہ نمبر ۳۷ پر اندراج کیا ہے۔ اسپرنگر کے اودھ کیٹلاگ کے صفحہ نمبر ۴۵۶ پر اس کا تعارف موجود ہے۔ اس ترجیع بند کا ایک شیرازہ بند نسخہ ڈائرکٹر آف دکن پوسٹ گریجویٹ اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پونہ، جناب تاراپور کے توسط سے مرحوم پروفیسر شیخ چاند احمد نگری کو دستیاب ہوا تھا۔ اس مخطوطے میں ترجیع بند صفحہ نمبر ۱۱ تا ۲۳ تک محیط ہے۔ دراصل یہ مخطوطہ کسی نادرشاہ کی تحویل میں تھا۔ جس میں کئی نظمیں اور منثور اقتباسات خط شکستہ میں درج ہیں۔ اس مخطوطے کا کاتب خورشید بن عبدل ہے۔ اس ترجیع بند کے چند اشعار تلف ہو چکے ہیں۔ تھامس بیل (Beale) نے اس ترجیع بند کے اشعار کی تعداد ۲۷۰ بتائی ہے۔ لیکن مرحوم نادرشاہ کے مخزونہ مخطوطے کے آخری بند کا تیسرا شعر اور ابتدائی بند کا ایک شعر ندارد ہے۔ کشفی کا ترجیع بند بحر مفرج مثمن اخرب مقبوض محذوف میں ہے۔

۲۔ مناقب مرتضوی: کشفی نے اس کتاب میں چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ کی سوانح، معجزات اور بہادری کے کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ اس کتاب میں نثر ونظم کے اقتباسات ہیں۔ یہ

کتاب ''مجموعہ راز کے بعد لکھی گئی تھی۔کیوں کہ مجموعہ راز کے مطبوعہ نسخہ (بمبئ ۱۳۲۱ھ) کے صفحہ نمبر ۱۲۱ پر اس کتاب کا حوالہ موجود ہے۔اس کتاب کے متعدد مخطوطے دستیاب ہیں۔ پہلے یہ کتاب بمبئ سے شائع ہوئی اور بعد میں ایران (تہران) سے طبع ہو چکی ہے۔

۳۔اعجاز مصطفوی: یہ کتاب حضور ﷺ کی حیات پر مبنی ہے۔ یہ کتاب مندرجہ بالا کتاب کے نہج پر لکھی گئی ہے۔اس کتاب کے مخطوطات نایاب نہیں ہیں (دیکھئے کیٹلاگ از ریوؔ: جلد نمبر ا صفحہ ۱۵۴، جامع مسجد آگرہ میں اس مخطوطے کا عمدہ نسخہ دستیاب ہے (؟) غالباً یہ مخطوطہ ہندوستان اور ایران میں لیتھوگراف ہو چکا ہے۔البتہ راقم التحریر کو اس کا مطبوعہ نسخہ نہ مل سکا۔

۴۔دیوان قصائد: اس دیوان میں قصائد کے علاوہ غزلیات اور مثنویات بھی ہیں۔ یہ دیوان زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔اسپرنگر نے موتی محل لائبریری لکھنو میں اس دیوان کا مخطوطہ دیکھا تھا۔(دیکھئے اودھ کیٹلاگ از اسپرنگر صفحہ نمبر ۴۵۶ میں اپنے مقالہ ''مسلمانانِ لکھنو کے کتب خانے'' (کلکتہ ۱۸۹۶ھ) میں کشفی کے دیوان کا حوالہ دیا ہے۔

۵۔رسالہ موسیقی: کشفی کی ایک مختصر کتاب فن موسیقی کے موضوع پر بھی ہے۔اس کا ایک مخطوطہ محمد یہ لائبریری آگرہ میں موجود تھا۔

منابع

(۱) دیکھئے۔مقالات مرحوم پروفیسر شیخ چاند احمد نگری (انگریزی میں)

(۲) شیخ چاند بن حسین احمد نگری کی علمی و ادبی خدمات از ڈاکٹر نور السعید اختر

(۳) برٹش میوزیم کیٹلاگ از چارلس ریو حصہ اول و دوم

(۴) اودھ کیٹلاگ از اسپرنگر

(۵) مجالس جہانگیری مرتبہ از عارف نوشاہی ایران

(۶) تزک جہانگیری (اردو ترجمہ)

روداد

دو روزہ ''مصادر سیرت نبویؐ'' سمینار

منعقدہ دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ

کلیم صفات اصلاحی

''حیات شبلی'' کا مقدمہ جس شخص کی نظر سے گذرا ہوگا اس کو یہ اندازہ ہوگا کہ علامہ شبلی نے مستشرقین کا مقابلہ کس طرح کیا؟ اس میں علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اہل علم و تحقیق کی توجہ اس جانب مبذول کرائی ہے کہ جب اہل یورپ نے عالم اسلام کو محکوم و مغلوب کیا تو ان کی تعلیم گاہوں میں ایسی کتابیں داخل نصاب کرنا ضروری خیال کیا جس کو پڑھ کر خود مسلمانوں کو ان کی اپنی شاندار روایات اور روشن علمی، تمدنی، مذہبی، قومی، سیاسی اور ملی تاریخ دھندلی اور ان کے اسلاف کے اظہر من الشّمس کارنامے پھیکے نظر آئیں، اس مقصد کی تکمیل کے لیے پہلے انہوں نے خود شارع اسلامؐ کی ذات اقدس کو منتخب کیا، اس کے بعد خلفائے راشدین و سلاطین اسلام کی حکومتوں کو جابرانہ و ظالمانہ ثابت کرنے کے لیے ان کی زندگی سے بے بنیاد واقعات تلاش کیے، ہندوستان میں ڈاکٹر اسپرنگر اور سر ولیم میور وغیرہ اور ہندوستان سے باہر ڈاکٹر جے، اے مولر، ڈاکٹر ویل، وان کریمر، نویلڈیکی، ولہاؤسن، گولڈزیہر، پروفیسر مارگولیتھ اور الہلال کے ایڈیٹر جرجی زیدان وغیرہ جیسے دانشور جن کا شمار دیدہ ور محققین میں ہوتا ہے، اسی قسم کی فتنہ انگیزیوں اور عالم اسلام کے خلاف مہیب سازشوں میں مصروف تھے، ظاہر ہے ان کو یہ مواد کچھ تو مسلمانوں کے قدیم ترین مراجع و مصادر اور علمائے سلف کے علمی و مذہبی تحقیقات سے حاصل ہوا تھا اور اکثر اسلام کے تئیں ان کی ازلی دشمنی، متعصّبانہ ذہنیت اور فکری کج روی کے ناگزیر نتائج تھے۔

اسلام و شارع اسلامؐ سے متعلق علمائے یورپ کی تحقیقات پر جب علامہ شبلیؒ کی نظر پڑی تو بے چین ہوگئے، پہلے تو انہوں نے مراجع و مصادر سیرت و تاریخ اسلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، واقعات سیرت

کی تحقیق میں کچھ اصول متعین کیے، قدیم مآخذ کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور یہ منصوبہ بنایا کہ مستشرقین نے اخذ روایات اور استنباط نتائج میں جو بے اعتدالیاں کی ہیں ان کے اسباب کا پتہ لگا کر ان کی تدلیسات، تحریفات، تلبیسات، دوراز کار قیاسات، غیر مستند اور غلط قسم کے معلومات کی حقیقت ظاہر کی جائے اور کوئی بات بغیر حوالہ کے نہ کہی جائے، ان کے اعتراضات وشکوک وشبہات کا جواب دینے کے لیے ان ہی کے قائم کردہ معیار تحقیق واسلوب کے مطابق طریقہ اپنایا جائے اور جن مراجع ومصادر کا استعمال انہوں نے اپنے اغراض فاسدہ کی تکمیل کے لیے کیا، اہل علم جانتے ہیں کہ واقعات سیرت کی تحقیق میں علامہ شبلیؒ نے ان کا استعمال مقاصد صالحہ کے لیے کیا۔

علامہ شبلیؒ سے پہلے سیرت کی تالیف وتصنیف میں مراجع ومصادر کا اہتمام نہیں تھا، مولانا پہلے شخص ہیں جنھوں نے مصادر کی اہمیت محسوس کی اور سیرت نگاری کے روایتی انداز کو بدلا، اس موضوع پر نئے انداز سے غور وفکر کرنے کی دعوت دی اور سیرت النبیؐ جیسی عظیم الشان تصنیف منصہ شہود پر آئی، جس کی ایک ایک سطر عربی اور فارسی کی مستند کتابوں کے ہزاروں صفحات کا نچوڑ اور اس سے مستنبط ہے، ضرورت تھی کہ بدلتے ہوئے حالات کے تناظر اور عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق اس اہم علمی خدمت کی تجدید اور اس کی تحقیقی روایت کو آگے بڑھایا جائے، چنانچہ اس بنیادی ضرورت کے پیش نظر دارالمصنفین کے موجودہ ڈائریکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے تقریباً دس مہینے قبل جنوری میں سالانہ سیرت سمینار کے انعقاد کی تجویز اپنے رفقاء کار کے سامنے رکھی اور اس سلسلہ کے آغاز کے لیے ''مصادر سیرت نبویؐ'' کا موضوع منتخب کیا، خصوصی تعلق کے سبب پروفیسر ظلی نے مجوزہ عناوین کی فہرست تیار کرنے کا کام مشہور محقق پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی صاحب (علی گڑھ) کے سپرد کیا، مصادر سیرت پر تحقیقی وتنقیدی نظر رکھنے والے معتبر اہل علم سے رابطہ ومراسلت اور سمینار سے متعلق دوسری ذمہ داریاں سینئر رفیق مولانا حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی کے سر ڈالی گئیں، ان کی معاونت کے لیے مولوی حافظ توقیر احمد ندوی رفیق دارالمصنفین حاضر تھے، اکثر اہل قلم حضرات کے مثبت اور تائیدی جواب سے عزم وحوصلہ کو مزید تقویت حاصل ہوئی، مقالہ نگاروں سے ۱۵؍فروری تک منظوری اور ۳۰؍جون ۲۰۱۰ء تک مقالات ارسال فرمانے کی درخواست کی گئی اور متوکلاً علی اللہ ۹؍۱۰؍۱۱؍اکتوبر ۲۰۱۰ء کی تاریخوں کا اعلان کردیا گیا۔

تاریخوں کے اعلان کے بعد جیسے ہر شخص کی زبان پر بس سمینار سمینار کا لفظ مچل رہا تھا، کچھ تو شمع نبوت کے پروانوں کی تحقیقات فکر ونظر سے مستفید ہونے کے خواہش مند تھے اور کچھ ان رہروایان

شوق کی دید سے اپنی آنکھوں کو روشن کرنا چاہتے تھے اور کچھ ان پاکیزہ فکر اہل قلم کی خدمت وضیافت کے لیے بے تاب تھے، بہرحال جوں جوں تاریخ قریب آتی گئی احاطۂ دارالمصنفین کو خوش نما و خوش منظر بنانے کی کوششیں تیز تر ہوتی گئیں، لائبریری اور کانفرنس ہال کی عمارتوں پر رنگ و روغن، ہال کے اندر اسٹیج، مائک اور پنکھوں کی سہولت، چمن بندی، صفائی، مقالہ نگاروں کو دینے کے لیے منتخب مقالات کی ایک ایک کاپی اور بیگ کی مہم سر کر لی گئی تھی، البتہ قدیم مہمان خانہ جو مندوبین کرام کی راحت و آسائش کے لحاظ سے ناکافی اور ڈائننگ ہال اور دیگر جدید سہولتوں سے محروم تھا، ہزارہا کوششوں کے باوجود اس لائق نہ ہوسکا کہ مہمانوں کو اس میں ٹھہرایا جاسکے اور اکیڈمی کے معزز مہمانوں کی خدمت کا افتخار پھر سے شبلی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر افتخار احمد کو حاصل ہوگیا۔

۹؍ اکتوبر سے پہلے ہی اس روح پرور علمی مجلس کی خوش گواری کا احساس ہونے لگا، ساؤتھ افریقہ (ڈربن) سے جانشین شبلی علامہ سید سلیمان ندویؒ کے خلف الرشید ڈاکٹر سید سلمان ندوی کی تشریف آوری نے گویا یہاں کے لوگوں کے حوصلوں میں جان ڈال دی، دارالمصنفین سے ان کا رشتہ و تعلق محتاج تعارف نہیں، ان کے بچپن اور عہد شباب کی پرلطف یادیں دارالمصنفین کے عہد اول کی علم پرور فضاؤں سے وابستہ ہیں، اسی تعلق خاطر کے سبب انہوں نے بے آرامی و بے سکونی کا خیال پس پشت ڈالتے ہوئے یہیں ٹھہرنا گوارا فرمایا اور جب تک رہے یاد ماضی کے چراغ جلاتے رہے، ان کی شخصیت متانت اور علمی وقار سے عبارت تھی، علی گڑھ سے پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی ڈاکٹر جمشید احمد ندوی کے ساتھ تشریف لائے، موضوع سیرت، علامہ شبلی اور یادگار شبلی سے ان کے علمی اور قلبی تعلق کو بتانے کی ضرورت نہیں، معارف کے صفحات اس کے گواہ ہیں، ان کی خوش اخلاقی وخوش کلامی اور سنجیدہ ظرافت کے نقوش شبلی اکیڈمی کے کارکنوں کے دلوں پر متعدد بار ثبت ہوچکے ہیں، ممبئی سے پروفیسر خورشید نعمانی اور مولانا محمد عارف عمری سابق رفیق دارالمصنّفین کے مقالات تو موصول ہوئے مگر ان کی عدم شرکت کا احساس برابر ہوتا رہا، اول الذکر نے دارالمصنفین کی ادبی، علمی اور تاریخی خدمات کا تعارف کرا کے اپنے بے پناہ تعلق کا ثبوت فراہم کیا اور دوسرے نے تقریباً بیس برس یہاں گزارے اور تذکرہ مفسرین ہند اور معارف میں گراں قدر مقالات تحریر کیے، مشہور و معروف صحافی جناب شمیم طارق نے پہلے پہنچ کر اہل ممبئی کی نمائندگی کی، اردو زبان وادب اور صحافت کی دنیا میں ان کے نام کو اب اعتبار حاصل ہوگیا ہے، خدا بخش لائبریری پٹنہ سے ڈاکٹر عتیق الرحمٰن صاحب نے بھی پہلے پہنچ کر شبلی اکیڈمی سے اپنے خلوص ومحبت کا

ثبوت بہم پہنچایا، ان کا موبائل پٹنہ ریلوے اسٹیشن پر چوری ہوگیا جس کی وجہ سے رابطہ میں بڑی دشواری ہوئی۔

مولانا سعید الرحمٰن ندوی اعظمی، مولانا واضح رشید ندوی (لکھنؤ)، مولانا محمد اجمل ایوب اصلاحی (ریاض)، مولانا عبد اللہ معروفی (دیوبند)، مولانا عنایت اللہ سبحانی (کیرلہ)، پروفیسر حسان خان (بھوپال)، مولانا سعید الرحمٰن (بنگلور)، پروفیسر محمد عثمان ندوی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (حیدرآباد)، مولانا الیاس بھٹکلی (کرناٹک)، مولانا ولی رحمانی (بہار)، مولانا نور الحسن کاندھلوی (کاندھلہ)، پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی، پروفیسر احتشام ندوی، پروفیسر صلاح الدین عمری، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، مولانا اشہد رفیق ندوی (علی گڑھ)، مولانا محمد یٰسین اختر مصباحی (دہلی) وغیرہ جیسے اصحاب علم وفضل کی کہکشاں اگر افق دار المصنفین پر جلوہ نما ہوتی تو اس کی بزم علمی میں یقیناً چار چاند لگ جاتا۔

۹ر تاریخ کی صبح ہوئی تو بقیہ اہل علم وتحقیق کی آمد کا سلسلہ جاری ہوگیا، دہلی سے پروفیسر سید عبد الباری شبنم سبحانی اور مولوی عبد المبین ندوی، ندوۃ العلماء لکھنؤ سے مولانا محمد علاء الدین ندوی، حیدرآباد سے ڈاکٹر فہیم اختر ندوی، علی گڑھ سے پروفیسر ظفر احمد صدیقی، پروفیسر سعود عالم قاسمی، ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی، امروہہ سے مفتی رفاقت حسین قاسمی وغیرہ تشریف لائے۔

ساڑھے دس بجے افتتاحی نشست کا آغاز طے تھا، جس کی صدارت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صدر مسلم پرسنل لا بورڈ ورکن مجلس انتظامیہ دار المصنفین کو کرنا تھی لیکن معلوم ہوا کہ مولانا محمد خالد غازی پوری کی اہلیہ کے انتقال کی وجہ سے رائے بریلی سے لکھنؤ سفر درپیش ہے، اس لیے افتتاحی اجلاس میں ان کی شرکت نہ ہوسکے گی۔ ان کی جگہ ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے کرسی صدارت کو زینت بخشی، مہمانان خصوصی کی نشستوں پر مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی اور پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی جلوہ افروز ہوئے، اس اجلاس کی کارروائی مولانا حافظ عمیر الصدیق دریابادی کے ذمہ تھی، حافظ عبد الرحمٰن قمر عباسی کی تلاوت سے اس نشست کا باضابطہ آغاز ہوا۔

پہلے تو ناظم اجلاس نے سمینار کی وقعت واہمیت اور شبلی اکیڈمی میں اس کے انعقاد کے اسباب پر مربوط ومنضبط تقریر کی، اس کے بعد پروفیسر اشتیاق احمد ظلی ڈائریکٹر شبلی اکیڈمی نے اپنا خطبۂ استقبالیہ زبانی پیش کیا، اپنے معزز مہمانوں اور عظیم ہستیوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے سمینار کے انعقاد کے مقصد اور سیرت پر علامہ شبلی کے مہتم بالشان کارناموں کی خوشبو اس انداز سے بکھیری کہ پورا مجمع عطر رسول

سے معطر ہو گیا، انہوں نے کہا کہ علامہ شبلی نے جس انداز میں سیرت کی تالیف کی ضرورت کا احساس دلایا ہے اس سے اہل علم واقف ہیں، ان کے مطابق علامہ شبلی کا خیال تھا کہ ''صرف ہم مسلمانوں کو نہیں بلکہ تمام عالم کو اس وجود مقدس کی سوانح عمری کی ضرورت ہے، یہ ضرورت صرف اسلامی، مذہبی نہیں بلکہ ایک علمی ضرورت، ایک اخلاقی ضرورت، ایک تمدنی ضرورت اور ایک ادبی ضرورت اور مختصر یہ کہ یہ مجموعہ ضروریات دینی و دنیوی ہے''، اسی بنیادی ضرورت کے پس منظر میں دارالمصنفین نے ارادہ کیا ہے کہ عہد حاضر کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر پھر اسی خدمت کی تجدید کی جائے اور اس کے لیے پہلا قدم مصادر کا تحقیقی، تنقیدی اور جامع تجزیہ ہے، انہوں نے مزید کہا کہ جس طرح قرآن مجید پر کام کی نہ کوئی حد ہے اور نہ کوئی پایاں اور وہ قیام قیامت تک جاری رہے گا، اسی طرح وہ ذات جو قرآن کی عملی تفسیر ہے، اس کی تعلیمات پر بھی کام ہوتا رہے گا اور آئندہ نسلیں اس سے روشنی حاصل کرتی رہیں گی، آخر میں پروفیسر ظلی نے جناب محمد منیر خان صاحب کرناٹک (مقیم مسقط) کا خصوصی تذکرہ کیا کہ اس خالص علمی مجلس مذاکرہ کے اصل محرک وہی تھے اور از راہ لطف و کرم اس کے تمام اخراجات کی فکر سے بھی پروفیسر ظلی کو بے نیاز کر دیا تھا، اس کے بعد کلیدی خطبہ کے لیے ڈاکٹر سید سلمان ندوی کو دعوت دی گئی، پہلے تو انہوں نے پروفیسر ظلی کی پر اصرار دعوت پر شکریہ ادا کیا، اس کے بعد دارالمصنفین سے وابستہ یادوں اور گذشتہ چند برسوں میں ہندوستان کے افق سے غائب ہونے والی علمی شخصیتوں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، سید صباح الدین عبدالرحمنؒ، مولانا مجیب اللہ ندویؒ اور مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ وغیرہم پر اپنے رنج و غم اور دکھ کا اظہار نہایت رقت آمیز انداز میں کیا کہ ان کے دم سے کسی بھی مجلس علمی کا وقار دوبالا ہو جاتا تھا، اس کے بعد اس اہم موضوع پر سمینار کے انعقاد کی کارکنان دارالمصنفین کو مبارک باد دی، پھر سیرت میں قدیم مصادر کی اہمیت اور ان پر نئے سرے سے غور و فکر کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ نے سیرت کے سلسلہ میں جو ٹھوکریں کھائی ہیں اس کی اہم وجہ یہ تھی کہ انہوں نے سیرت کو تاریخ کا ایک جزو سمجھ کر مغازی اور تاریخ کی کتابوں تک محدود رکھا، اس فرق کو مصادر سیرت کے تحقیقی تجزیہ کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا، اس کے علاوہ اکیڈمی کی کتابوں کے انگریزی تراجم سے متعلق اہم تجاویز پیش کیں اور اس راہ کی دشواریوں کے ازالہ میں ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ خطبہ استقبالیہ خاصا طویل اور عالمانہ و فاضلانہ ہونے کے باوجود پورے التفات و انہماک سے سنا گیا، کلیدی خطبہ کے بعد مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی رکن مجلس انتظامیہ دارالمصنفین سے تاثرات کے لیے درخواست کی گئی،

ان کو علم حدیث اور سیرت رسول سے جو دلچسپی ہے، اس سے اہل علم واقف ہیں، اپنی تقریر میں مولانا مدظلہ نے ایک عجیب وغریب بات جو اب تک شاید ہی کسی نے کہی ہو یہ فرمائی کہ علامہ شبلیؒ کو اللہ تعالیٰ نے سیرۃ النبیؐ کی تصنیف اور اس کے مصادر و مراجع کی تحقیق و تنقید کے لیے تیار کیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ وسائل کی کمی کے باوجود انہوں نے اس میدان میں ایک ایسی شاہراہ بنائی جس کو ان کے متاخرین نے سرمۂ نظر بنایا اور اس کی اقتدا کی، اس کے بعد پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی تشریف لائے جن کی گل افشانی گفتا سے اہل مجلس متعدد بار لذت اندوز ہو چکے تھے، پروفیسر صدیقی نے فرمایا کہ کارکنان دارالمصنفین اس اہم اور اپنی نوعیت کے منفرد سمینار کے انعقاد کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں، ضرورت ہے کہ علامہ شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی کے کارناموں کو انہیں کے قائم کردہ معیار کے مطابق آگے بڑھایا جائے اور یہ سمینار انشاء اللہ اس سلسلہ میں سنگ میل ثابت ہوگا۔ اس کے بعد صدارتی تقریر ہوئی اور آخر میں ڈاکٹر فخر الاسلام اصلاحی اعظمی رکن مجلس انتظامیہ دارالمصنفین نے اپنے معزز مہمانوں، حاضرین مجلس اور اکیڈمی کے تمام خدمت گذاروں میں اکثر کا نام بہ نام شکریہ ادا کیا۔ مضافات کی مشہور تعلیم گاہوں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے صدر المدرسین مولانا انیس احمد اصلاحی، مولانا محمد ایوب اصلاحی، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، جامعۃ الفلاح بلریا گنج کے مولانا سلامت اللہ اصلاحی (مہتمم)، مولانا عبدالحسیب اصلاحی، مولانا نعیم الدین اصلاحی، ، مولانا رحمت اللہ اثری، جامعہ اسلامیہ مظفر پور کے مولانا خطیب الرحمٰن ندوی وغیرہ نے شرکت کی، ان کے علاوہ جامعۃ الرشاد اور شہر اعظم گڈھ کے سربرآوردہ افراد سابق ایم ایل جناب عالم بدیع، ڈاکٹر جاوید (ماہر امراض ہڈی)، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی اعزازی رفیق دارالمصنفین وغیرہ، اساتذہ شبلی کالج ڈاکٹر سلمان سلطان (رکن مجلس انتظامیہ دارالمصنفین)، ڈاکٹر جاوید علی خاں (صدر شعبہ تاریخ و اعزازی رفیق دارالمصنفین)، مولانا سہیل احمد اصلاحی (استاد شبلی انٹر کالج)، ڈاکٹر شباب الدین (صدر شعبہ اردو)، ڈاکٹر علاؤالدین اصلاحی (ریڈر شعبہ تاریخ)، ڈاکٹر محی الدین آزاد اصلاحی (صدر شعبہ عربی) وغیرہ اور بعض سرکاری عملہ کی شرکت نے اس افتتاحی نشست کے وقار و رونق میں اضافہ کر دیا۔

افتتاحی نشست کے بعد چائے کے لیے مختصر وقفہ رکھا گیا تھا، نماز ظہر کے بعد مدعوئین کے لیے اکیڈمی کے نئے ڈائننگ ہال میں ظہرانہ کا اہتمام تھا، سمینار کی پہلی باقاعدہ نشست نماز مغرب کے بعد طے تھی، اس کی صدارت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی کو کرنا تھی، ان کی غیر موجودگی کے سبب اس کی

صدارت پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی نے فرمائی اور نظامت کے فرائض جناب شمیم طارق نے انجام دیے، نشست شروع ہوئی ہی تھی کہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی تشریف لائے جن کے انتظار وشوق دید میں ہر قلب مضطرب اور ہر فرد چشم براہ تھا، کرسی صدارت پر پروفیسر صدیقی متمکن ہو چکے تھے، اس لیے مولانا نے ازراہ عنایت صف سامعین اپنے لیے پسند فرمائی اور ضعف وتکن کے باوجود نشست کے مقالات سماعت فرماتے رہے۔ اس میں ڈاکٹر مولانا تقی الدین ندوی صاحب کا مقالہ ان کے پوتے مولوی فرید الدین ندوی، مولانا محمد علاء الدین ندوی، استاذ ندوۃ العلما لکھنؤ، مولوی فضل الرحمٰن اصلاحی قاسمی، اسکالر دارالمصنفین، جناب شمیم طارق اور ڈاکٹر عتیق الرحمٰن خدابخش لائبریری پٹنہ نے اپنے مقالات پیش کیے، مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی کا مقالہ سیرۃ النبی (جلد اول تا ہفتم) کے بحث وتجزیہ پر مشتمل تھا اور ہر جلد کے مشمولات کا جائزہ لے کر یہ بتانے کی کوشش کی گئی تھی کہ یہ کتاب واقعی سیرت نگاری میں انسائیکلو پیڈیا ہے، مقالہ نگار چونکہ خود شریک مجلس تھے بہتر ہوتا اگر خود پیش کیا ہوتا، حاضرین میں سے اکثر مولانا مدظلہ کی گل افشانی گفتار کے منتظر تھے، مولانا علاء الدین ندوی صاحب نے قاضی عیاض کی الشفا کا ناقدانہ وعالمانہ جائزہ لیا، مقالہ محققانہ ہونے کے ساتھ ساتھ اسلوب وزبان کے لحاظ سے خوب تھا، محاکمہ کی بھی بھرپور کوشش کی گئی تھی، مولوی فضل لرحمٰن اصلاحی نے شمائل ترمذی کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا اور کو شمائل نبوی کی اہمیت ومعنویت پر اچھے انداز میں روشنی ڈالی، اس کے بعد خود ناظم اجلاس جناب شمیم طارق نے "The Historical Role of Islam" مصنفہ M.N. Roy کی روشنی میں سیرت نگاری کے تاریخی منہاج کے موضوع پر اپنا قیمتی اور منفرد نوعیت کا مقالہ پیش کیا جو گو کہ براہ راست سمینار کے موضوع سے ہٹ کر تھا، خود مقالہ نگار کا یہ کہنا کہ یہ کتاب اگرچہ سیرت کی کتاب نہیں لیکن چونکہ اس میں اسلام کی مقبولیت وپیش رفت کا معروضی جائزہ اور حقیقت پسندانہ اعتراف ہے، اس لیے سیرت کی کتابوں میں اس کا شمار کرتے ہوئے ان مصادر ومراجع پر توجہ دی گئی ہے جن کی بنیاد پر مصنف نے نتائج اخذ کیے ہیں، کسی بھی موضوع پر جناب شمیم طارق صاحب کے غور وفکر کا انداز یقیناً نرالا ہوتا ہے اور یہ مقالہ ان کی اسی متفکرانہ اور جدت پسندانہ ذہنیت کی غمازی کرتا ہے، اسی لیے اس مقالہ کی تحسین بھی اہل علم سے حاصل ہوئی، اس نشست کا آخری مقالہ ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن کا کتاب المختصر فی سیرۃ نبی البشر کے تعارف اور علمی وتحقیقی جائزہ پر مشتمل تھا، یہ خدابخش لائبریری پٹنہ کے نادر ذخیرہ مخطوطات میں محفوظ ہے، علامہ شبلی نے مقدمہ میں اس کا ذکر کیا ہے اور یہ دنیا کا واحد نسخہ ہے جس کی

دوسری کاپی کہیں نہیں ہے، ڈاکٹر صاحب نے اس کا بھرپور تعارف کرایا ہے اور مصادر سیرت میں اس کے شمار کے اسباب کا احاطہ اور اس کی علمی وفنی قدر و قیمت ظاہر کی ہے، صدر اجلاس پروفیسر صدیقی کے عالمانہ تبصرہ پر یہ نشست مکمل ہوئی۔

اس کے بعد مختصر سا وقفہ لذت کام ودہن کے لیے رکھا گیا اور مقالات کی دوسری نشست فوراً ہی شروع کردی گئی، جس کی صدارت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور نظامت مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی استاذ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر نے کی، قبل اس کے کہ مقالہ نگاروں کو دعوت دی جاتی، ضعف وپیرانہ سالی اور دور دراز کے اس سفر سے ہونے والی تکان کا لحاظ کرتے ہوئے صاحب صدر کو خطبہ صدارت کے لیے زحمت دی گئی، مولانائے محترم نے اپنی صدارتی تقریر میں دارالمصنّفین کی موجودہ انتظامیہ کو اس بروقت موضوع پر مذاکرہ کے اہتمام کی مبارک باد پیش کی، اس کے بعد ندوہ اور دارالمصنّفین کے تعلق کی نوعیت اور اس کی تاریخی حقیقت سے حاضرین مجلس کو آگاہ فرمایا اور کہا کہ ندوہ کو دارالمصنّفین سے بہت جذباتی اور گہرا تعلق ہے اور اس تعلق کو نہ کبھی ختم کیا جاسکتا ہے اور نہ کبھی کم۔ مولانا شبلیؒ اور سید سلیمان ندویؒ ندوہ کے معتمد تعلیم رہے اور ندوی فضلا نے نہ صرف یہاں کے کاموں میں حصہ لیا بلکہ اپنی زندگیاں وقف کردیں، اس سے دونوں کے تعلق کی نوعیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، سیرت کے موضوع پر کانفرنس کرنا بہت ہی خوش آئند اور بابرکت قدم ہے اس لیے کہ دارالمصنّفین کا آغاز حقیقت میں سیرت کی خدمت میں ہوا اور اس موضوع پر علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کے کام کو اولیت حاصل ہے، علامہ شبلی کی سیرۃ النبی کو تقریباً ایک صدی ہونے والی ہے لیکن قارئین کو اس کی قدامت وطوالت عمر کا احساس تک نہیں ہوتا بلکہ جتنی بار پڑھیے اس کی تازگی وحسن ادا اور اسلوب نگارش کی جاذبیت وکشش میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے اور آج بھی پورے عالم اسلام میں اس کی مقبولیت ومطالبہ کی صدائے بازگشت اور عاشقان نبوت کی زبان حقیقت ترجمان سے ھل من مزید کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے مرتبین کا اسلوب تحقیق وتنقید نرالا اور آیندہ نسلوں کے لیے قابل اتباع تھا، اس نشست میں مولانا تقی الدین ندوی، مولانا سید سلمان ندوی اور پروفیسر ظلی اسٹیج پر مولانائے محترم کے ہم نشین تھے، خطبہ کے بعد مولانا کے لیے زیادہ دیر تک بیٹھنا دشوار ہورہا تھا اس لیے واپس مظفر پور چلے گئے اور ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے ان کی جگہ سنبھالی، اس کے بعد مقالات کا سلسلہ شروع ہوا، جس میں تین مقالے پیش کیے گئے، پہلا مقالہ جناب سید عبدالباری شبنم سبحانی نے مصادر سیرت میں ابن قیم کی زادالمعاد کا مرتبہ،

کے عنوان سے نذر مجلس کیا، جس میں انہوں نے فرمایا کہ سیرت پاک کا موضوع ایک بحر ناپید کنار ہے، ابن قیم کی زاد المعاد کو بلا شبہ سیرت کے مصادر میں شمار کیا جاتا ہے، انہوں نے زاد المعاد کا محققانہ جائزہ لیتے ہوئے سیرت نویسی میں زاد المعاد کی اہمیت اور اس کے مقام و مرتبہ کا تعین کیا، سجانی صاحب صاف وسلیس اور شستہ نثر لکھنے میں ماہر ہیں، ان کے مقالہ کا ہر اقتباس اس کا گواہ ہے، دوسرا مقالہ الطبقات الکبریٰ لابن سعد اول و دوم سیرت نبوی کا اہم وقدیم ماخذ کے موضوع پر مولانا عبدالمبین ندوی نے پیش کیا، ابن سعد کی آٹھ جلدوں میں انہوں نے صرف اول و دوم کو جس کا زیادہ حصہ سیرت سے متعلق ہے موضوع بنایا اور اپنے مقالہ کو ہر اعتبار سے بہترین مقالہ بنانے کی کوشش کی ہے، تحقیقی رنگ زیادہ نمایاں ہے، تیسرا اور اس نشست کا آخری مقالہ ڈاکٹر فہیم اختر ندوی کا تھا، انہوں نے بھی ابن قیم کی زاد المعاد پر تجزیاتی نگاہ ڈالی اور کہنا چاہیے کہ موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کی پوری کوشش کی اور اس کی انفرادیت کے متعدد پہلو بھی تلاش کیے ہیں، آخر میں صدر مجلس کے کلمات عالیہ پر اس نشست کے خاتمہ کا اعلان کردیا گیا۔

تیسری نشست ۱۰/ اکتوبر کی صبح ساڑھے آٹھ بجے شروع ہوئی، اس کی صدارت فن سیرت خصوصاً مولانا شبلی کی سیرت النبی پر ناقدانہ نظر ڈالنے والے پروفیسر ظفر احمد صدیقی اور نظامت ڈاکٹر جمشید احمد ندوی نے کی، اس نشست کا پہلا مقالہ علوم اسلامیہ خصوصاً سیرت کے موضوع پر ماہرانہ ومحققانہ نگاہ رکھنے والے معتبر اہل قلم پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی کا سیرت ابن اسحاق / ابن ہشام کا تنقیدی جائزہ کے عنوان سے تھا، یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کی ہر تحریر تحقیق وجستجو، دقت نظر اور جودت فکر کا آئینہ ہوتی ہے، ان کا یہ مقالہ بھی ان خصائص کا حامل اور ان کی تحقیقی بصیرت کا عکس جمیل تھا، مقالہ کے آخر میں ان کا یہ تجزیہ یقیناً قابل توجہ ہے کہ سیرت ابن اسحاق / ابن ہشام میں بہت سے واقعات سیرت اور احوال زمانہ کا ذکر نہیں ملتا اور یہ اس کا بڑا نقص ہے اور یہ دعویٰ وہی کرسکتا ہے جس نے واقعتاً مصادر سیرت کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہو، دوسرا اہم اور دلچسپ مقالہ طبقات ابن سعد - ایک مطالعہ کے عنوان سے پروفیسر سعود عالم قاسمی نے پیش فرمایا، ان کے انداز بیان میں ٹھہراؤ کے ساتھ ساتھ زبان وادب کی تازگی بھی نمایاں تھی، آٹھوں جلدوں کا اس قدر گہرائی، باریک بینی اور قدرے تفصیل سے جائزہ پہلی بار کسی نے اردو میں لیا ہے جس میں اس کے مشمولات ابن سعد کے ساتھ اس کے منہج، ترتیب طبقات اور مآخذ کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہو، مراجع کی دوسری کتابوں سے محاکمہ نے اس مقالہ کی خوبی میں اور اضافہ کردیا ہے۔ تیسرا

ابن نفیس کے رسالہ کاملیہ کے تعارف و تجزیہ سے متعلق تھا، ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی کے اس مقالہ نے اپنی انفرادیت کے سبب اہل علم کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیابی حاصل کی، بعض لوگوں نے مصادر سیرت میں اس رسالہ کے شمار و اعتبار پر ہی اعتراض کیا جس کا جواب خود مقالہ نگار نے خوش اسلوبی سے دیا اور صاحب صدر نے بھی اپنے منطقیانہ دلائل سے اس کی مصدریت و مرجعیت پر مہر تصدیق ثبت کردی، ڈاکٹر صاحب یقیناً ایک فاضل و لائق اسکالر ہیں اور ان کی تحقیقات کو دنیائے علم و تحقیق میں اہمیت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اس نشست کا آخری مقالہ سیرۃ النبی شبلی میں روایات طبری - ایک جائزہ کے عنوان سے راقم نے پیش کیا، اس کے بعد صدر اجلاس نے مقالات سے متعلق اپنے تاثرات سامعین کے سامنے پیش کیے، اس نشست کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں صاحب صدر نے کھل کر ہر مقالہ پر اپنی مفید اور قابل قدر رائے ظاہر فرمائی، جس سے مقالہ نگاروں کو بڑا حوصلہ ملا، ان کا عالمانہ تبصرہ سیرت کے مصادر پر ان کی تحقیقی نگاہ اور وسعت مطالعہ کا ثبوت ہے۔

۱۵ منٹ کے وقفہ کے بعد مقالات کی چوتھی اور آخری نشست آراستہ کی گئی، اس کی صدارت پروفیسر سعود عالم اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر فہیم اختر ندوی نے انجام دیے، اس میں کل ۴ مقالے پیش ہوئے، پہلا پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے علامہ واقدی فن سیر کے امام کے عنوان سے پیش کیا اور واقدی کو معتبر و مستند تذکرہ نگاروں کے بیانات کی روشنی میں فن سیرت کا امام ہی نہیں ثابت کیا بلکہ پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی کے بہ قول فاضل مقالہ نگار نے انتہائی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک مطعون کو محبوب بنادیا اور میں ان کی اس جرأت کو سلام کرتا ہوں دوسرا مقالہ مولانا محمد عمر اسلام اصلاحی کا سیرت رسول کا اہم ترین ماخذ - قرآن مجید کے عنوان سے تھا، مقالہ نگار چونکہ مدرسۃ الاصلاح میں قرآن کے استاذ ہیں اور قرآن ہی ان کا موضوع تحقیق ہے اس لیے وہ بجاطور پر حضرت عائشہؓ کے جواب ''کان خلقہ القرآن'' کی عملی تصویر پیش کرنے کے اہل تھے، انداز بیان محققانہ ہونے کے ساتھ دلکش بھی ہے، تیسرا مقالہ جناب مفتی رفاقت حسین قاسمی نے آیات سیرت کا تجزیاتی مطالعہ کے عنوان سے پڑھا، نوجوان محقق کا یہ خیال صد فیصد صحیح ہے کہ قرآن و سیرت ایک ہی خوبصورت نقش کے دو پہلو ہیں اور دونوں کو الگ کر کے سمجھنے کی کوشش گمرہی ہے نہ کہ حق رسی، ان کے مطابق قرآن کریم کی ہر آیت آپؐ ہی کی کسی ادائے دلنواز کا بہترین پیرایۂ اظہار ہے، اسی احساس کے تحت مقالہ نگار نے قرآن کی ہر وہ آیت جو کسی نہ کسی حیثیت سے ذات رسول سے تعلق رکھتی ہے، انتخاب کر کے تحلیلی تجزیہ کی کوشش کی ہے اور اچھی کوشش ہے، طرز ادا کی خوبی نے بہ طور خاص اپنی

جانب متوجہ کیا ہے، مقالات کی آخری نشست کا آخری مقالہ ڈاکٹر جمشید احمد ندوی نے سیرت نبوی کے مفقود مصادر کے موضوع پر لکھا اور مفقود مصادر سیرت کو دو زمروں میں تقسیم کیا ہے، پہلے زمرہ میں ان کتابوں کو شامل کیا ہے جن کی مرویات مصادر میں ادھر اُدھر بکھری ہیں اور دوسرے میں وہ کتب سیرت ہیں، جن کا تذکرہ ان کے مصنّفین کی دیگر کتب کی فہرست کے ساتھ ملتا ہے اور عام طور سے ان کی مرویات نہیں ملتیں، مقالہ نگار کو مصادر و مراجع سے خصوصی دلچسپی ہے اور یہ مقالہ ان کے اسی اختصاص کا مظہر اور بڑا ہی معلوماتی ہے، آخر میں صدر اجلاس نے مقالات پر نہایت مناسب اور عالمانہ تبصرہ فرمایا۔

سمینار کی روایت کے مطابق آخری نشست اصلاً میز بانوں اور مہمانوں کے اظہار تشکر کے لیے خاص ہوتی ہے، مختصر وقفے کے بعد ڈاکٹر سید سلمان ندوی کی صدارت اور ڈاکٹر شباب الدین صدر شعبہ اردو شبلی کالج کی نظامت میں یہ آخری بزم بھی سجائی گئی، تاثرات کے لیے پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی ، مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی ، پروفیسر سعود عالم قاسمی اور جناب شمیم طارق کو بلایا گیا ، مدعوبین کے یہ جذبات و تاثرات اکیڈمی کے ذمہ داروں کے لیے بڑے حوصلہ افزا تھے، بعض مشورے اور تجویزیں بھی سامنے آئیں مثلاً اگلے سمینار کے موضوع کے تعلق سے ایک عنوان ”غیر مسلم سیرت نگاروں کی تحقیقات“ کا دیا گیا اور موجودہ ماحول میں رواداری کا لحاظ کرتے ہوئے برادران وطن کو بھی اس سیرت سمینار میں شرکت کی دعوت کی بات بھی کہی گئی ، دوسری تجویز یہ بھی آئی کہ اگلے سمیناروں میں مدارس عربیہ کے آخری درجات کے طلبا کو بھی مدعو کیا جائے ، تاکہ رسول اکرمؐ کی تعلیمات سے کماحقہٗ واقفیت اوران کی ذہنی تربیت کا موقع فراہم ہو، آخر میں پروفیسر ظلی نے مہمانان کرام کا شکریہ ادا کیا، انہوں نے اہالیان اعظم گڈھ، شبلی کالج اور مدارس کے اساتذہ وطلبہ، دارالمصنفین کے شعبہ علمی و انتظامی سے وابستہ تمام افراد خصوصاً جوائنٹ سکریٹری جناب عبدالمنان ہلالی ، مولانا حافظ عمیر الصدیق ندوی ، ڈاکٹر فخر الاسلام اصلاحی اعظمی ، مولوی توقیر احمد ندوی ، حافظ عبدالرحمٰن قمر عباسی ، اسلم فہمی ، سلیم جاوید اعظمی ، مولوی فضل الرحمٰن اصلاحی قاسمی ، مولوی محمد صادق اصلاحی ندوی ، حافظ محمد شریف محسنی ، حافظ سمیع الرحمٰن رشادی ، مآب عالم فلاحی ، ابوسعد فلاحی ، ظریف الحسن ، محمد ماجد ، محمد ذاکر ، محمد زاہد ، محمد شاہد ، محمد عامر ، محمد طارق ، (صاحب زادگان مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ) وغیرہ کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا کہ ان کی رات دن کی غیر معمولی محنت سے اس شاندار اور باوقار سمینار کو کامیابی نصیب ہوئی ، اللہ تعالیٰ ان سب کو اجر جزیل عطا فرمائے ، صدر مجلس کی دعا پر سمینار کا خاتمہ بالخیر ہوگیا۔

اخبار علمیہ

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی، سہارنپور، دیوبند سے وابستہ پروفیسر محمد سلیمان کی نبیرہ رضیہ سلطانہ نے قرآن مجید کا سنسکرت میں ترجمہ کر کے اپنا نام قرآن عظیم کے خدمت گذاروں میں درج کرالیا ہے۔اس اہم کارنامہ کی تکمیل میں انہیں بارہ برس لگے، تاخیر اس لیے ہوئی کہ قرآنی الفاظ و اصطلاحات کی تعبیر و تفہیم کے لیے سنسکرت کے متبادل الفاظ کا فقدان تھا۔ دنیا کی مختلف زبانوں کو قرآن مجید کی ترجمانی کا فخر حاصل تھا، اب ایک قدیم ترین زبان کو بھی اعزاز حاصل ہوگیا، ایک مسلم خاتون کا یہ کارنامہ خواتین اسلام کی خدمات میں ہمیشہ یادرکھا جائے گا۔

قرآن ہی سے متعلق یہ خبر بھی دل چسپ ہے کہ عالم اسلام خصوصاً سعودی عرب میں حفظ قرآن کے بے شمار شعبہ جات و درجات قائم ہیں، حفظ قرآن کی دولت کے خواہش مندوں میں بچے، جوان، بوڑھے سبھی شامل ہیں۔خبر کے مطابق چند برس کی مسلسل محنت شاقہ کے بعد سعودی عرب کی ایک معمر ۸۶ سالہ خاتون نے نہ صرف حفظ قرآن کی سعادت حاصل کی بلکہ پچھلے دنوں حفظ قرآن کے مقابلہ برائے طالبات میں شرکت بھی کی۔

۲۰۰۷ء میں سب سے زیادہ بکنے والی کتاب کا نام ''افسوس - یورپ نے گھٹنے ٹیک دیئے'' ہے، اس مشہور کتاب کے یہودی مصنف اور صحافی ہنرک بروڈ کا قبول اسلام اس لحاظ سے اہم ہے کہ کل تک جس نے مذہب اسلام کے خلاف اپنی تمام تر ذہنی و فکری صلاحیتیں صرف کیں، اسلام پر جدید طرز معاشرت اور اسلوب زندگی سے متصادم ہونے کا الزام لگایا اور اپنی تحریروں اور بیانات میں صاف کہا کہ میں نہیں چاہتا کہ یورپ اسلام کے آگے گھٹنے ٹیک دے اور اگر ایسا ہوا تو میں اپنے نوجوانوں کو یورپ سے ہجرت کر جانے کا مشورہ دیتا ہوں، وہی معاند اسلام آج اسلام کے سایہ رحمت میں پناہ لیتا ہے اور اس حقیقت کا پھر اظہار کرتا ہے کہ ع

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

الجزائر کی وزارت برائے امور اسلامیہ نے موسم گرما میں روزہ رکھ کر محنت مزدوری

کرنے والوں کے لیے ایک حکم نامہ جاری کیا کہ تراویح میں قرأت ضرورت سے زیادہ طویل نہ کی جائے، کیونکہ اس سے زیادہ تر نمازیوں میں بے دلی اور بے زاری آتی ہے اور تراویح کا مقصد بھی فوت ہوجاتا ہے، حکم نامہ کے مطابق ہر امام دو دو رکعت پر مشتمل آٹھ رکعت پڑھائے اور ہر رکعت میں قرآن مجید کے صرف آٹھویں حصے کی تلاوت کی جائے، وتر اس میں شامل نہ ہوگی، رپورٹ کے مطابق اس کی خلاف ورزی کرنے والے ائمہ سزا کے مستحق ہوں گے، حکومت نے ہر مسجد میں پابندی اوقات کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ نام نہاد مسلمان حکومتوں کے ایسے احکام ان کی بے شعوری اور عبادات کی روح سے لاعلمی کا ثبوت ہیں۔

قزاقستان کی ۱۵ رملین آبادی میں ۹ رملین خواتین ہیں، وہاں کی عورتوں کی شرح عمر ۷۱، جب کہ مردوں کی ان سے دس سال کم ۶۱ ربرس ہے، عورتیں وہاں بھی بے روزگار ہیں جو برسر روزگار ہیں ان کی تنخواہ اور پنشن بھی مردوں سے کم ہی ہے، حالانکہ خاندانی کفالت عموماً عورتوں کے ذمہ ہے، مجلس قانون ساز میں عورتیں ۹۴ فیصد ہیں اور اس لحاظ سے ۱۲۶ ممالک میں قزاقستان ۸۵ ویں نمبر پر ہے، ۲۰۴۳۰ تنظیموں میں سے صرف ۱۵۰ خواتین کے زیر انتظام ہیں، ان کا معاشی انحصار حکومتی وظائف پر ہے لیکن گذشتہ چند برسوں سے ایک انقلاب دیکھنے میں آرہا ہے کہ مختلف شعبوں اور حکومتی اداروں میں خواتین کی شمولیت کو ضروری بنانے کی کوشش تیز تر ہوئی ہیں، آئینی حقوق تو حاصل ہیں اور آرٹیکل ۱۴ کے مطابق قانون کی نظر میں مرد و عورت حقوق میں مساوی ہیں، جنس، شہریت، زبان اور مذہب کی بنیاد پر کوئی بھی اس قانون سے مبرا نہیں، ملازمت پیشہ خواتین کو بچوں کی پیدائش پر دو سال کی تنخواہ کا ۴۰٪ اور ایک سال کی چھٹی دی جاتی ہے، جڑواں بچوں کے اخراجات کا پچاس فیصد حکومت برداشت کرتی ہے، مطلقہ عورتوں اور ان کے بچوں کو وظیفہ ملتا ہے اور اب تو مجہول النسب بچوں کو معاشرہ کے لیے قابل قبول بنانے کی مہم بھی ہے کہ اس میں ان معصوموں کا کیا قصور ہے۔

۲۰۰۳ء میں عراق پر امریکی حملہ کے بعد بیشتر عراقیوں کی کل متاع برباد ہوگئی، اکثروں نے اپنے بچوں کو اسکولوں سے اس لیے ہٹالیا کہ ان کے پاس فیس کے پیسے نہیں، اب تلاش معاش

ہے، وزارت تعلیم کے ترجمان ولید حسن نے اس افسوس ناک حقیقت کا اظہار کیا کہ اس وقت ملک کا ہر پانچواں شہری ناخواندہ ہے اور اس کی ایک وجہ امریکی غارت گری بھی ہے۔

عالمی ادارہ یونیسکو کے مطابق وہ شخص پڑھا لکھا کہا جائے گا جو اپنی روزہ مرہ کی زندگی اور معمولات کے بارے میں کچھ لکھ اور پڑھ سکے، اس معیار پر فلسطین کے مرکزی ادارہ شماریات نے جو رپورٹ پیش کی ہے، اس کے مطابق فلسطین کے بالغ افراد میں ناخواندگی کی شرح پوری دنیا میں سب سے کم ہے، ۲۰۰۹ء میں پندرہ سال سے زائد عمر کے ایسے افراد صرف ۶ء۵ فیصد ہیں اور اس میں بھی خواتین نسبتاً زیادہ ہیں، عالمی لحاظ سے ناخواندہ بالغان کی شرح ۶ء۱۶ ہے۔

گھیکوار مشہور پودا ہے، امریکہ، یورپ وغیرہ کے متعدد طبی اداروں میں طبی لحاظ سے موضوع تحقیق ہے، معلوم ہوا کہ جسم کے اندرونی و بیرونی نظام صحت کے لیے یہ ایک مکمل دوا ہے، جلدی امراض، جلدی سرطان، جلنے، جھلسنے، امراض دہن اور کیڑے مکوڑوں کے کاٹنے کی تکلیف کے ازالے میں یہ گویا اکسیر ہے، امریکہ کے دانتوں کے ایک تحقیقی مرکز نے دکھایا ہے کہ اس کی کلیاں کرنے سے منہ کے چھالے اور زخم مندمل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح مسوڑھوں کے ورم کی شکایت اور دانت نکلوانے کے بعد ہونے والے زخموں میں اس کا لعاب خاصا مفید ہے۔ یہ جدید تحقیقی اعتراف ہے، قدیم طب نے تو بہت پہلے اس کا اظہار کر دیا تھا۔

ورجینیا ٹکنیکل یونیورسٹی کے محققین نے دو گروپوں پر مشتمل ۴۸ افراد کی آزمائش کے بعد بتایا کہ جو لوگ دن میں تین مرتبہ کھانا کھانے سے قبل دو گلاس یعنی اوسطاً 5lb پانی کا استعمال کرتے ہیں ان کا وزن کم رہتا ہے، ماہرین نے اپنی اس جائزہ رپورٹ کو بوسٹن میں واقع امریکن کیمکل سوسائٹی کے قومی اجلاس میں پیش کی، تقریباً ۱۲ ہفتوں تک دو گروپوں پر تحقیق کے بعد محققین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کھانے سے قبل پانی کا استعمال کرنے والوں کا تقریباً 15.lbs تک وزن کم ہوا ہے، جب کہ دوسرے گروپ کے افراد میں تقریباً 11.lbs تک وزن کم ہوا۔

ک، ص اصلاحی

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

ماہنامہ المومنات (خصوصی اشاعت، مسلم پرسنل لا اور خواتین کے مسائل): مدیر مسئول نجیب الحسن صدیقی ندوی، صفحات: ۱۵۲، کاغذ وطباعت عمدہ، قیمت: خصوصی شمارہ ۵۰ روپے، فی شمارہ ۱۰ روپے، سالانہ ۱۰۰ روپے، پتہ: ماہنامہ المومنات، اودھ انکلیو، ہردوئی روڈ، دوبگا، لکھنؤ۔

مسلم پرسنل لا کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع اور متنوع ہے، یہ واحد ادارہ ہے جو مسلمانوں میں بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں میں معتمد علیہ ہے، اس کی ذمہ داریوں میں مسلمانوں کے لیے قانون میں شریعت کے تحفظ، حکومت وعدالت کی دخل اندازی کا دفاع اور مسلم معاشرہ میں اصلاح اور صراط مستقیم کی رہنمائی شامل ہے، زیر نظر رسالہ جامعۃ المومنات الاسلامیہ کا ترجمان ہے، اس ادارہ کے بانی مسلم پرسنل لا کے پرجوش اور متحرک داعی تھے، رسالہ کے مشمولات میں پرسنل لا اور خواتین سے متعلق کئی عمدہ مضامین ہیں، جیسے ہندوستانی مسلمان- خطرات اور اندیشے، موجودہ حالات اور ہماری ذمہ داریاں، جدید تقاضے اور مسلم پرسنل لا، عدلیہ، انصاف اور دار القضا، اسلام میں عورت کا مقام، بیوہ خواتین کی کفالت اور معاشرہ کی ذمہ داریاں جنس نسوانی پر حضرت عائشہؓ کے احسانات، خواتین کی معاشی اور اقتصادی صورت حال، میراث کی تقسیم اور عورتوں کی حق تلفی کا مسئلہ، اصلاح معاشرہ کی ہمہ گیر تحریک کا تصور، عالم اسلام میں نافذ مسلم پرسنل لا کی صورت حال اور شریعت اسلامیہ کا تحفظ اور مسلم پرسنل لا بورڈ وغیرہ سارے مضامین پرسنل لا بورڈ کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہیں اور اس کے مقاصد وافادیت پر روشنی ڈالتے ہیں، ابتداء میں صدر پرسنل لا بورڈ اور دیگر اکابرین کے نافع پیغامات ہیں اور مدیر معاون محمد وقار الدین لطیفی ندوی کی تحریر بورڈ کے بارے میں اہم معلومات اور اس کے اب تک کے صدور کی مختصر حالات زندگی پر رسالہ کی افادیت میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔

مجلّہ الاخبار: مدیر محمد ناصر سعید اکرمی، صفحات: ۲۵۰، کاغذ وطباعت وکتابت عمدہ، قیمت

درج نہیں، پتہ: ناظم معہد البنا الشہید، پوسٹ بکس نمبر ۱۳، مدینہ کالونی، بھٹکل۔ ۵۸۱۳۲۰۔

معہد امام حسن البناء الشہید دینی، اصلاحی اور دعوتی خدمات میں مصروف بھٹکل کا موقر ادارہ ہے، زیر نظر مجلہ اس کا ترجمان ہے، فلسطین ہمارا قومی مسئلہ ہے، ادارہ نے اس کی اہمیت وضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس شمارے کو اس کے لیے خاص کیا ہے، فلسطین کی ایک تلخ تاریخ ہے مگر موجودہ دور میں مسلمان بالخصوص نوجوان اس سے ناواقف ہیں، مسجد اقصیٰ آج تاریخ کے انتہائی نازک دور سے گزر رہی ہے، اس پر یہودی سازشوں کی یلغار ہے، ان کی خفیہ اور بدترین سازش ہے کہ اسے منہدم کرکے ہیکل سلیمانی تعمیر کیا جائے، اس سطحی مقصد کی تکمیل کے لیے مسجد کے گردونواح اور القدس میں مسلسل یہودی آبادی میں اضافہ کیا جارہا ہے۔ مسجد اقصیٰ کے نیچے گہری اور طویل سرنگوں کی کھدائی بھی اسی کا حصہ ہے تاکہ زمین کھوکھلی ہوکر (نعوذ باللہ) مسجد خود بخود شہید ہوجائے، ان امور اور سرزمین فلسطین کے دیگر مصائب وآلام کی بھرپور تفصیلات سے رسالہ مملو ہے، ایسے حالات میں مسلم ممالک اور بااختیار ارباب حل وعقد کی سنجیدہ جدوجہد کی اشد ضرورت ہے، خدانخواستہ قبلۂ اول کسی سازش کا شکار ہوتا ہے تو تمام مسلم قوم بالخصوص مسلم حکمراں اللہ کے دربار میں مجرموں کی صف میں ہوں گے۔

بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کی حفاظت کے بہت سے ذرائع اور طریقے ہیں، جنہیں ہم اپنا سکتے ہیں۔ جن سے وہاں برسر پیکار نوجوانان ملت کو حوصلہ ملے گا اور ان کے ولولہ میں مضبوطی آئے گی، ان کو احساس ہوگا کہ ہمارے پیچھے ساری قوم کھڑی ہے، مجلّہ میں ان تمام امور کی طرف رہنمائی کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں بیداری کی مہم کا ایک خطّہ تیار کرکے عمل کی ترغیب دی گئی ہے۔ اکابرین علماء ومحققین مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی، مولانا سید سلمان حسینی ندوی، پروفیسر اختر الواسع، مولانا اسرار الحق قاسمی، ڈاکٹر یوسف القرضاوی، مولانا نعمت اللہ عسکری اور دیگر نوجوان لکھنے والوں کے مضامین معلومات افزا ہیں اور پراثر بھی۔ ادارہ اس اہم اشاعت اور نیک مقصد کے لیے مبارک باد کا مستحق ہے۔

جرنل - ۵ (تاریخ گجرات کا تحقیقی مطالعہ): مرتبہ پروفیسر محی الدین بمبئی والا، صفحات: ۳۷۴، کاغذ وطباعت وکتابت بہتر، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سنٹر، حضرت پیر محمد شاہ روڈ، پانکورنالہ، احمد آباد، گجرات، ہند۔

حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سنٹر گجرات کی علمی وثقافتی تاریخ کو اجاگر کرنے اور

منظر عام پر لانے کی کوششوں میں سرگرم ہے، گجرات کی علمی، مذہبی اور تمدنی تاریخ اسلامی ہند کی برکات کی تاریخ ہے، وہاں کے مسلم فرماں رواں کی علمی خدمات اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا کہ شیراز و یمن اور دیگر ممالک اسلامیہ کے گوشہ گوشہ سے ممتاز علماء اور علم کے شیدائیوں نے گجرات کا قصد کیا اور اپنے علوم سے اس سرزمین کو سیراب کیا۔ جس کے نتیجہ میں عظیم شخصیتیں سامنے آئیں، گجرات کی تاریخ ایسی ہی ہے کہ اس کی بار بار بازخوانی افادیت سے خالی نہیں، شاید اسی مقصد کے تحت ادارے نے متنوع موضوعات پر مشتمل پر مغز مقالوں کا یہ مجموعہ پیش کیا ہے۔ زیر نظر شمارہ تصوف، تاریخ، مذہب اور ادبیات پر تحقیقی اور تنقیدی مقالات گنجیہ ہے، سلیقے سے مرتب کیے گئے مضامین اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں میں ہیں، سب سے پہلی تحریر ڈاکٹر مقصود احمد کی ''تصوف کی حقیقت'' کے عنوان سے تصوف پر سیر حال بحث ہے، ایک مختصر مقالہ احمد آباد کے دسویں صدی ہجری کے فارسی شاعر شیخ یحییٰ مفتی اور ان کے کلام پر پروفیسر محبوب حسین عباسی کا ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے شیخ یحییٰ مفتی کے نئے دریافت شدہ کلام کی اہمیت کو واضح کیا ہے، اس سے قبل ان کے کلام کا تعارف ''احمد آباد میں مدفون فارسی شعراء'' نامی مقالے میں شائع ہو چکا تھا۔ اس نئے دریافت شدہ کلام میں ایک بیانیہ قصیدہ چار تاریخی قطعے اور سات مکمل غزلیں، نیز دیگر تین غزلوں کے چند اشعار شامل ہیں۔ محمد ولی عبداللہ نورولی کا مقالہ ''مناقب علامہ محمد بن طاہر گجراتی (محدث پٹنی)'' پر ہے، فاضل مقالہ نگار نے محدث پٹنی سے قبل علم حدیث درس حدیث، آداب اور شیوخ حدیث کے مرتبہ وشان پر روشنی ڈالنے کے علاوہ گجرات میں علم حدیث کی مختصر تاریخ بھی بیان کی ہے۔ پروفیسر جمال الدین شیخ کا مقالہ ''کتاب گنج المعانی باسم حضرت صاحب قرانی'' کے عنوان سے ہے۔ ڈاکٹر عصمت ناز کے مقالے کا عنوان ''چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں کی علمی وادبی حالت، سیاسی تناظر میں'' ہے، مقالہ میں علمی، ادبی، ثقافتی اور سیاسی سوجھ بوجھ اور ترقی کا بہترین جائزہ لیا گیا ہے، اس دور میں نامور ادیب عالم و فاضل پیدا ہوئے، حدیث، فقہ، لغت، شعروشاعری، ادب، تاریخ اور خطابت وغیرہ میں خوب ترقی ہوئی جو بعد کے دور میں سیاسی تباہی و بربادی کے باعث نہیں ہوئی۔ ایک مقالہ ''تاریخ سلاطین گجرات'' کے عنوان پر سید محمود بخاری کا فارسی زبان میں ہے۔ انگریزی زبان میں ڈاکٹر تاراچند کا مضمون گجراتی علماء وفضلاء پر معلومات افزا ہے۔ علم وتحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ شمارہ مفید معلومات کا ذخیرہ ہے۔

ت، ا، ندوی

مطبوعات جدیدہ

میزان: از جناب جاوید احمد غامدی، قدرے بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات: ۶۵۸، قیمت: ۵۰۰ روپے، پتہ: المورد کے-۵۱، ماڈل ٹاؤن، لاہور، پاکستان۔

اس ضخیم کتاب میں ایمان واخلاق، عبادات اور پھر معاشرت، سیاست، معیشت، جہاد، تعزیرات، دعوت اور دوسرے رسوم وآداب کے متعلق دین کے احکام کا بیان بھی ہے اور تجزیہ بھی، یہ بیان وتجزیہ کسی فوری غور ومطالعہ کا نتیجہ نہیں بلکہ بقول مصنف ''کم وبیش ربع صدی کے مطالعہ وتحقیق کا حاصل ہے''۔ اس باب میں ان کے فکری رہنما مولانا امین احسن اصلاحی ہیں، اس طرز فکر کو سمجھنے کے لیے ایک نہایت مفصل مقدمہ ہے جو دو حصوں یعنی اصول ومبادی اور دین حق میں منقسم ہے، دین ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے جو اس نے پہلے انسان کی فطرت میں اور پھر تمام تفصیلات کے ساتھ اپنے پیغمبروں کے ذریعہ انسان کو بخشی اور نبی آخرالزماںؐ کے بعد اس زمین پر دین کا ماخذ تنہا آپ کی ذات والا صفات ہے اور سنت سے ان کی مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی کریمؐ نے تجدید واصلاح اور بعض اضافوں کے ساتھ جاری فرمایا، تعداد میں اس قسم کی سنتوں کی تعداد انہوں نے چھبیس بتائی ہے کہ ان میں کسی بحث ونزاع کی کوئی گنجائش نہیں، حدیث کو انہوں نے اخبار آحاد سے تعبیر کیا ہے کہ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ کبھی درجہ یقین کو نہیں پہنچتا اس لیے دین میں ان سے کسی عقیدہ وعمل کا اضافہ بھی نہیں ہوتا، اس تمہید کے بعد انہوں نے دین کے ہر پہلو پر اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں اور جابجا اپنے سرچشمہ علم، مولانا امین احسن اصلاحی اور تدبر قرآن کا بالجہر اقرار بھی کیا ہے، سنن کی بحث بھی اسی طرح بہت مبسوط ہے جس کے متعلق یہ نقطہ نظر واضح کیا گیا کہ سنت صرف وہی چیز ہوسکتی ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے دین ہو، جنگ کا میدان ہو، اسلحہ کا استعمال ہو، تعمیر ہو، طریقہ خورد ونوش ہو، خاص وضع کا لباس ہو ان کے نزدیک کوئی بھی چیز سنت نہیں اور یہ صرف ان ہی کے نزدیک نہیں بلکہ ان کے الفاظ میں ''کوئی صاحب علم اسے سنت کہنے کے لیے نہیں تیار ہوسکتا'' آگے مزید کہا گیا کہ ''علم وعقیدہ''، تاریخ، شان نزول اور اس طرح کی دوسری چیزوں کا سنت سے کوئی تعلق نہیں، دلیل یہ ہے کہ قوموں کے ساتھ جزا وسزا کے معاملے کو سنت اللہ کہا گیا اس لیے سنت کا لفظ ہی اس سے ابا کرتا ہے کہ ایمانیات کی کسی چیز پر اس کا اطلاق کیا جائے اور یہ بھی کہ عملی نوعیت کی وہ چیزیں بھی سنت نہیں ہوسکتیں جن کی ابتدا پیغمبر کی بجائے قرآن سے ہوتی ہے بلکہ اس کو قرآن کی تفہیم اور اسوۂ حسنہ سے تعبیر کیا جانا

چاہیے، سنت کی تفہیم میں انہوں نے کئی اصول بیان کرنے کے بعد کہا کہ یہ رہنما اصول ہیں جن کی روشنی میں سنت بھی قرآن ہی کی طرح پوری قطعیت سے متعین ہو جاتی ہے، تدبر حدیث میں بھی انہوں نے کئی اصول متعین کیے، عربیت کا ذوق، قرآن کی روشنی، موقع ومحل اور عقل ونقل وغیرہ، مثلاً الائمۃ من قریش کی مشہور روایت کے ظاہر الفاظ سے بقول مصنف ''علماء اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ مسلمانوں کے حکمراں صرف قریش سے ہوں گے، یہ بات مان لی جائے تو اسلام اور برہمنیت میں کم سے کم سیاسی نظام کی حد تک کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا، اس مغالطے کی وجہ محض یہ ہوئی کہ ایک بات جو نبی کریمؐ کی وفات کے فوراً بعد کی سیاسی صورت حال کے لحاظ سے کہی گئی تھی اسے دین کا مستقل حکم سمجھ لیا گیا''، اس لیے مصنف کی نظر میں تدبر حدیث کے لیے موقع ومحل کے اصول کی رعایت ناگزیر ہے، اسی طرح عقل ونقل میں وہ فرق پر یقین نہیں رکھتے کہ دین کی بنیاد ہی علم وعقل کے مسلمات پر قائم ہے۔ پوری کتاب ان ہی اصولوں کی روشنی میں لکھی گئی ہے اور مجموعی اعتبار سے اس میں قاری کے لیے دین کے تمام اہم معلومات کے ساتھ اسباب وعلل اور حکمت ومصلحت کی باتیں آجاتی ہیں، نمایاں خوبی سلیس اور مربوط انداز گفتگو ہے، کہیں کہیں ادعائی لہجہ کے باوجود کہا گیا ہے ''یہ ایک طالب علم کا نتیجہ فکر وتحقیق ہے'' اور یہ کہ ''اس سے اگر اللہ تعالیٰ کے دین کی کوئی خدمت ہوئی ہے تو اسے قبول فرمائے اور مغفرت کا ذریعہ بنادے'' ہم اس دعا پر آمین کہتے ہیں۔

تذکرۂ اطبائے اودھ: از پروفیسر حکیم سید کمال الدین حسین ہمدانی مرحوم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گردپوش، صفحات: ۵۳۲، قیمت: ۳۵۰ روپے، پتہ: ادارہ ادبیات دلی ۵۸۰۳، صدر بازار دہلی۔

تہذیب وتمدن، ثقافت اور اخلاق وآداب اور رسوم وعادات میں اودھ مرحوم کی بے شمار اور بے مثال یادگاریں ہیں، خصوصاً اٹھارہویں صدی کے آغاز سے یعنی جب اودھ سعادت خاں برہان الملک کے دور سعادت میں آیا اس وقت سے اس خطے نے علوم وفنون کی خدا جانے کتنی وسیع ورفیع منزلیں طے کیں، ان میں علم طب کو نمایاں حیثیت حاصل ہے کہ طب یونانی کے نہایت حاذق وماہر اہل فن نے اودھ کے قصبات اور گاؤں تک میں مسیحائی کا اعجاز اس طرح دکھایا کہ علوم دینیہ کے مدارس اور ادب وشعر کے دبستانوں کی طرح طب میں بھی اودھ کی حیثیت دار السلطنت کی سی ہوگئی، دہلی کے زوال کے بعد اودھ کے اس عروج کا مطالعہ عبرت انگیز ہے اور چشم کشا بھی ع تم شمع بن چکے ہو اور ہم پگھل رہے ہیں

اودھ کے اطباء نے طب کو فن شریف کس طرح بنایا اس کا اندازہ اسی کتاب میں حکیم عبدالحسیب

دریابادی کے ایک خطبہ سے ہوتا ہے جس میں انہوں نے اس علم کے متعلق فرمایا کہ اس فن کی اشرفیت کا احساس واستحضار بروقت ضروری ہے، دوسرے فنون پر قیاس کر کے اسے روزی کمانے یا حصول جاہ کا ذریعہ نہ بنایا جائے بلکہ یہ صرف خدمت خلق اور عبادت خالق سمجھ کر اپنایا جائے، طبیب اگر متقی نہ ہو تو وہ طبیب نہیں، سو بیماروں کا ایک بیمار ہے، یہ وہ بنیاد تھی جس نے طب کو علوم دینیہ کی طرح شرف وعزت سے سرفراز کیا تھا اور اس کی بہترین مثالیں اودھ کے اطباء کی شکل میں ملتی تھیں، ان اطباء کی ایک بڑی اہمیت یوں بھی ہے کہ انہوں نے مغربی علوم وفنون کی یلغار میں اس علم وفن قدیم کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خوبی سے نبھائی اور مشرقی بلکہ اسلامی تہذیب وثقافت کی اس یادگار کو بالکل پامال ہونے سے بچالیا، اب جب کہ اس علم کی ترقی کی کوششیں تیز ہوتی جاتی ہیں، ان باکمال اطباء کا تذکرہ اوران کے کارناموں کی یاد اور بھی ضروری ہوگئی ہے، غالباً اسی مقصد سے سید کمال الدین جیسے باکمال حکیم وطبیب نے اودھ کے اطباء کا ایک مکمل تذکرہ تیار کیا اور لکھنؤ، غازی پور، اعظم گڈھ، امروہہ، بنارس، فرخ آباد، رام پور، علی گڑھ، بدایوں جیسے شہروں کے علاوہ دریاباد، ردولی، کنتور، مبارک پور، زنگی پور، سندیلہ، کاکوری، خیرآباد، حلالی اور بلگرام جیسے اودھ کے قصبات کے نامور طبیبوں کے ذکر سے اس کتاب کو مزین کردیا، گو فاضل تذکرہ نگار کو قلق رہا کہ یہ ان کی خواہش کے مطابق نہ ہوسکا، تاہم سینکڑوں اطباء کے حالات کا استقصاء بجائے خود نہایت قدر وقیمت کا حامل اور لائق ہے، اس کے علاوہ طب کے موضوع پر ان کے قلم سے تیس کے قریب کتابیں نکلیں، اس لیے ان ہی کو زیب تھا کہ یہ تذکرہ بھی ان ہی کے قلم سے ہو، بعض موضوعات جیسے اودھ کا محل وقوع، نوابان وشاہان اودھ کی مدت وزارت و بادشاہت، نوابان اودھ کے عہد میں طب یونانی کا فروغ سے کتاب کی افادیت میں اور اضافہ ہوا ہے، حکیم مغفور کے صاحب زادے پروفیسر عزیز الدین حسین ہمدانی تحسین وتبریک کے مستحق ہیں کہ انہوں نے والد کی وفات کے بعد اس کتاب کو شائع کر کے خدمت والدین کی سب سے بڑی سعادت حاصل کی اوران کی روح کو مسرور بھی کیا اور خود ایک عمدہ مقدمہ بھی شامل کتاب کیا۔

اسلام کے بارے میں ۱۰۰ سوال: از علامہ محمد غزالی، ترجمہ جناب مولانا ابومسعود اظہر ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۴۸۸، قیمت: ۱۵۰ روپے، پتہ: مکتبہ اشاعت القرآن، ۴۱۵۹، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی-۶۔

اسلام کیا ہے، قضا وقدر اور اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں کا مطلب کیا ہے؟ قرآن کیسے جمع کیا گیا یا نمازیں پانچ وقت ہی کی کیوں؟ تلوار والی آیت کیا ہے، غلامی کا تصور اور حضورؐ کی شادیوں کی حکمت کیا ہے، فقہی

مسالک چار کیوں ہیں، کیا نقاب فرض ہے، تعدد ازدواج کی حقیقت کیا ہے، عالم غیب کی مملکت اور قطب وغیرہ کیا ہیں، کیا اسلام آج کے مسائل کا حل پیش کرتا ہے وراس کا مستقبل کیا ہے؟ ایسے ہی آج کے انسان کے ذہن میں پیدا ہونے والے سو سوالوں کا جواب اس کتاب میں ہے، ان سوالوں کا محرک بجائے اعتراض کے ذہانت اور قلب و دماغ کی تسکین و تشفی ہے، عالم عرب کے مشہور مفکر علامہ محمد غزالی کے سامنے جب یہ سوال آئے تو انہوں نے جدید اسلوب میں سائلین کی ذہنی و نفسیاتی حالت کو پیش نظر رکھ کر معقول و مدلل اور تشفی بخش جواب دیے، مثلاً اللہ تعالیٰ کے ناموں کے متعلق لکھا کہ یہ کمال و جلال کی اعلیٰ صفات کے نمائندہ ہیں، اللہ تعالی طاق ہے اور طاق عدد ہی پسند فرماتا ہے، اسمائے حسنیٰ کو یاد یا شمار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے تمام ناموں اور صفات کو دھیان میں رکھا جائے، چند ہی صفات کو نہیں، ایک جگہ بتایا گیا کہ چاروں ائمہ فقہ علم و تقوی، امت کی خیر خواہی اور وقت کے حکمرانوں کی ترغیب و ترہیب سے بے نیاز تھے، عظیم تھے لیکن کسی نے اپنے آپ کو ملت پر تھوپا نہ اپنی اطاعت کا شرعاً مکلف بنایا، ان کے درمیان اختلافات کے پیچھے قابل احترام رائیں ہیں، اصل مسئلہ اختلاف رائے میں نہیں اس کے پیچھے موجود غلو و تعصب میں ہے، جناب اظہر ندوی کا ترجمہ بھی بڑا سلیس اور رواں ہے، ترجمہ نگاری اور ترجمانی میں ان کا قلم مشاق ہے، یہ کتاب بھی اس خوبی کی دلیل ہے، افسوس ہے کہ ان سطروں میں اس کا ذکر تاخیر سے آیا ہے۔

تصفیۃ العقائد : از حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات: ۵۶، قیمت: درج نہیں، پتہ: شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند، یوپی۔

مولانا نانوتوی اور سرسید احمد خاں کے درمیان بعض عقائد کے متعلق خط و کتابت ہوئی تھی اور اہل علم میں معروف ہے، اس سلسلۂ مراسلت میں پیر جی محمد عارف اہم کڑی تھے، یہ سوالات یا سرسید کے اصول و عقائد اس کتاب میں پندرہ ہیں جیسے دینیات میں سنت کی اطاعت پر ہم مجبور ہیں اور دنیاوی امور میں مجاز، احکام منصوصہ بالیقین ہیں، باقی مسائل اجتہادی اور قیاسی سب ظنی ہیں، خدا کے ہونے پر ایمان کے ہم مکلف ہیں مگر اس کی ماہیت ذات کے جاننے پر مکلف نہیں وغیرہ، مولانا نانوتوی نے ان کا جو جواب دیا وہ اس مختصر لیکن بہت وقیع رسالے کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، ان دونوں بزرگوں کا طرز تخاطب سب سے اہم ہے، ایک طرف سرسید مولانا نانوتوی کی کفش برداری کو باعث فخر سمجھتے ہیں دوسری طرف مولانا نانوتوی مولانا سرسید کی اولوالعزمی اور دردمندی کے قائل ہوکر ان سے اظہار محبت کو بجا قرار دیتے ہیں۔ ہاں فساد عقائد کے متعلق کچھ باتیں سن کر رنجیدہ خاطر ضرور ہو جاتے ہیں، اس لحاظ سے بھی یہ رسالہ اختلاف آراء و مسائل میں ایک رہنما کی حیثیت رکھتا ہے۔ ع-ص